(42)

عطاء الرحیم حامد

المنار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (القرآن)

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

(تعلیم الاسلام کالج ربوہ)

علم و عمل

سرپرست :- صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل

نگران :- چوہدری محمد شریف خالد

مدیر اعلیٰ :- رشید احمد جاوید

مدیر :- عابد ربانی

جنوری ، فروری ، مارچ ۱۹۶۳ء

جلد ۱۳ شمارہ ۲

پرنٹر و پبلشر :- حفیظ ہاشمی - مطبع :- ضیاء الاسلام پریس - سرورق :- نصرت آرٹ پریس

ربوہ

شمولیات

(۱) اداریہ .... ادارہ .... ص ۳

(۲) مقالات ومضامین

طلبِ علم .... پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم۔اے ص ۹

غزوۂ بدر .... عطاء المجیب اشد بی۔اے۔فاضل ص ۱۵

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا اقبال احمد نجم بی۔اے رسال اول ص ۲۰

خیالات کی دنیا میں .... مقبول ملک بی۔اے رسال اول ص ۲۴

دربارِ نبوی کے انمول موتی .... غلام رسول آشنا بی۔اے (فاضل) ص ۲۶

نوعمر فاتح .... آفتاب احمد بی۔اے (فاضل) ص ۲۸

ادبا در بنیادی انسانی اقدار۔ جیلانی کامران ایم۔اے آنرز ص ۲۹

شاعرِ مشرق علامہ اقبال .... عبد الرزاق ایف۔اے رسال دوم ص ۳۴

قومی روح .... نعیم قادسی ایف۔اے رسال اول ص ۳۶

محبت .... حضرت قاضی اکمل صاحب ص ۳۷

جسٹس ایم۔آر کیانی مرحوم .... سید منیر حسین شاد ایف۔اے رسال دوم ص ۴۰

(۳) افسانے:۔

جو کبھی نہ مٹ سکے؟ .... عابد ربانی ایف۔اے رسال اول ص ۴۱

محبت کے آنسو! .... انعام اللہ ہاشمی بی۔اے رسال اول ص ۴۳

غیرت کا امتحان .... رشید حبا وید .... ص ۴۸

سہیل .... س۔ڈ نجمی بی ایس سی رسال سوم آنرز ص ۵۵

آخری سہارا .... قمر الدین بونا پارٹ ایف۔اے رسال اول ص ۵۶

دوست آں باشد .... برکت اللہ طاہر بی۔اے رسال سوم آنرز ص ۵۷

(۴) آپ کے خطوط ..... قارئین "المنار" ..... ص ۸

(۵) طنز و مزاح

اے آزمانے والے یہ نسخہ نہ آزما .... محمد اسلم ظفر ایف۔اے رسال دوم ص ۵۹

مرد سیاست سے ایک انٹرویو .... ممتاز احمد ایف۔اے رسال دوم ص ۶۲

اتفاق ضروری نہیں!! .... محمود اصغر مجاہد ص ۶۷

ہم نے بھی امتحان دیا .... منصور احمد بی۔اے سال اول ص ۶۸

فلاں ابنِ فلاں .... عابد علی عابد ایف۔ایس سی سال دوم ص ۷۰

ٹوپی .... عبد الغفور احسان ایف۔ایس سی سال دوم ص ۷۲

(۶) تعارف .... ارشد ترمذی .... ص ۷۵

(۷) کالج کے شب و روز .... ا۔ت .... ص ۷۹

(۸) تبرکات

مدح النبیؐ .... حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ ص ۸۱

محمد صلے اللہ علیہ وسلم .... حضرت حافظ سید مختار احمد شاہجہانپوری ص ۸۲

(۹) منظومات و غزلیات۔

چل تو پڑا ہے قافلہ .... شیخ روشن دین تنویر ص ۸۴

غزل .... ارشد ترمذی .... ص ۸۵

غزل .... ارشد ترمذی .... ص ۸۶

غزل .... کریم قسمر .... ص ۸۷

سالِ نو .... عابد ربانی .... ص ۸۸

غزل .... پروفیسر چوہدری محمد شریف خالد ص ۸۹

تعلیمی اصلاحات کا احیاء

کیوں اور کیسے؟

تعلیمی اصلاحات کا احیاء — کیوں؟ اس کے متعلق ہم نے المنار کے گذشتہ شمارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ہمارے اظہارِ خیال کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک لمبا عرصہ ہمیں اپنے تعلیمی نظام کے مفید اور تعمیری ہونے کے بارہ میں سخت شکایت رہی۔ اس شکایت کے پیش نظر "قومی تعلیمی کمیشن" کی سفارشات کی روشنی میں قوم کے سامنے ایک نیا نظام تعلیم پیش کیا گیا۔ لیکن عین اس وقت جبکہ نئے تجربہ کے نتائج ظاہر ہونے والے تھے اور پھل پکنے کے قریب تھا حکومت کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ نئی اصلاحات کو ملتوی کر دے۔ ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس التواء کے باعث ہمارے قومی تعلیمی معیار کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ پھر ایک قوم جس کی معیشت تباہ حال پڑی ہے اس کیلئے تو ایسا التواء کسی صورت بھی خوش آئند نہیں کہلا سکتا۔ ہم نے ملک و قوم سے ہمدردی رکھنے والے طلبہ سے اپیل بھی کی تھی کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں اور وسیع تر قومی مفاد کی خاطر ایثار و قربانی سے کام لیں۔

اس فرصت میں ہم تعلیمی اصلاحات کے اس پہلو پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا احیاء کیسے ہو؟ کسی نظریہ، کسی قوم یا کسی نظام کے احیاء کے متعلق رائے دیتے ہوئے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اس کے زوال اور ناکامی کے اسباب کا مطالعہ کیا جائے اور پھر ان اسباب کی روشنی میں احیاء کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جائے

چنانچہ اس اصول کے پیش نظر سب سے پہلے ہم ان وجوہ اور اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں جو تعلیمی اصلاحات کے التواء کا باعث ہوئے۔

پہلا سبب اس التواء کا نوجوانوں کے اندر قومی روح کا فقدان ہے ہمارے نزدیک اس سبب کو مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے اسلئے کہ وہ قوم جس کے اندر قومی روح زندہ ہو۔ وہ مشکلات اور آزمائش کے اوقات میں کبھی نہیں گھبراتی اس قوم کے افراد اس راز کو خوب سمجھتے ہیں کہ اگر اس مرحلہ پر وہ ثابت قدم رہے تو ان کا ایثار اور قربانی ہی زندہ قوم کو تا دیر زندگی بخشنے کا باعث بنے گا۔ پس اگر ہمارے نوجوانوں میں قومی روح کا جذبہ موجود ہوتا تو ایسی مفید اصلاحات کا التواء ہرگز وقوع میں نہ آتا۔

دوسرا سبب التواء کا وہ غیر معمولی مالی بوجھ ہے جو ان اصلاحات کے نفاذ کے ساتھ طلبہ کے سرپرستوں اور والدین پر پڑا۔ اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک کا اوسط درجہ کا باشندہ بہت ہی غریب ہے، اسے بعض اوقات دو وقت کا کھانا بھی پیٹ بھر کر نصیب نہیں ہوتا۔ اندریں حالات غریب والدین فیسوں، کتابوں اور دیگر تعلیمی ضروریات کے غیر معمولی اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہ تھے پس نئی اصلاحات کے خلاف نفرت اور ناپسندیدگی کے جذبات کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر بن گیا۔

تیسرا سبب ان اصلاحات کے التواء کا ان کے نفاذ کے بعد

فیل ہونے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے تعلیمی حلقوں میں ایک قسم کی افراتفری پیدا کر دی۔ بہت سے لوگ تعلیمی اصلاحات کے مفید ہونے میں شک کرنے لگے۔ اس سبب کی کئی ضمنی وجوہات ہیں:۔

اوّل جب ایک دم معیارِ تعلیم بلند ہوا تو طلبہ کے اذہان پر نفسیاتی طور پر یہ خیال مسلط ہو گیا کہ نصاب ان کے اصل معیار سے زیادہ مشکل ہے طلبہ کو محنت کرنے کی عادت نہ تھی اور نیا نصاب تعلیم محنت اور ریسرچ کی اہمیت چاہتا تھا۔ پھر نہ صرف نصاب معیاری ہو گیا تھا بلکہ کامیابی کے معیار بھی بلند ہو گئے تھے چونکہ یہ دو طرفہ ارتقاء یکدم عمل میں آیا نتیجہ یہ ہوا کہ فیل ہونے والوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی۔

دوسری وجہ تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی تھی جب معیارِ تعلیم بلند ہوا تو اس کیلئے لازمی تھا کہ موزوں اور اہل اساتذہ بھی موجود ہوتے مگر یہ چیز یہاں مفقود تھی نتیجہ یہ نکلا کہ طلبہ اپنے کورسز کو کماحقہٗ سمجھ ہی نہ پائے۔

تیسری وجہ مجوزہ نصابی کتب کی کمیابی تھی ادھر تعلیمی سال ختم ہونے کو آیا ادھر کتابیں ساحلِ سمندر لگیں۔ ظاہر ہے جب مجوزہ نصاب ہی موجود نہیں تو طلبہ کیا کر سکتے ہیں ستم یہ تھا کہ جو کتب مہیا تھیں وہ بھی اصل قیمت سے کئی گنا زیادہ قیمت پر بک رہی تھیں ——— طلبہ کی مایوسی اور اضطراب برابر بڑھتا رہا۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ فیل ہونے والے طلبہ عام کالجز میں قانونی پابندیوں کے باعث داخلہ نہ لے سکتے تھے ادھر ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کو سمیٹنے کیلئے نئی اور تکنیکی ادارے موجود نہ تھے آوارگی اور بے روزگاری میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس چیز کا اثر بھی تعلیمی اصلاحات کی مخالفت کی صورت میں رونما ہوا۔

اب جبکہ ہم نے اصلاحات کے الٹوا کی وجوہات معلوم کر لی ہیں تو احیاء کیلئے لائحہ عمل تیار کرنا چنداں مشکل نہیں۔ ہمیں ان تمام خامیوں کو دور کرنا چاہیئے جن کے باعث الٹواءِ اصلاحات کا افسوسناک واقعہ ہوا۔

(۱) قوم کے نوجوانوں کے اندر ایثار اور قربانی کے جذبات کو ابھارنا چاہیئے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو ایک دن میں ہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کیلئے ہمیں مسلسل جدوجہد کرنا ہوگی والدین اساتذہ، نصابی کتب، پریس، سینما اور ریڈیو اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ والدین اور اساتذہ کو اپنی جگہ پر اور دوسرے متعلقہ افراد کو اپنی جگہ پر قوم کی اس خدمت سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ جب ہمارے نوجوان اپنے ذات سے بالا ہو کر قومی سطح پر سوچنے کے عادی ہو جائینگے تو بڑے سے بڑا ترقیاتی پروگرام بھی بغیر کسی تکلیف اور مزاحمت کے تکمیل پذیر ہو جائیگا۔

(۲) مالی تکلیفات کا ازالہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ حکومت فیسوں اور دوسرے متعلقہ تعلیمی اخراجات کو ملک کے سوادِ اعظم کے لئے قابلِ برداشت بنائے۔ بلکہ تعلیمی اخراجات تو قابلِ برداشت حد سے بھی کچھ کم ہی ہونے چاہئیں۔ قوم کی ہر بہی خواہ حکومت کو یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیئے کہ تعلیمی سرمایہ کاری ملکی ترقی کے لئے ازبس ضروری ہے وہ لوگ غلط رستہ پر ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ تعلیمی سرمایہ کاری معاشی ضیاع ہے حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی معاشی ترقی تربیت یافتہ افراد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ روس کی ترقی کا راز اسی بات میں ہے کہ وہاں عوام کی تعلیم و تربیت کیلئے زبردست سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ حسن ابدال کیڈٹ کالج میں تقریر کرتے ہوئے صدر ایوب نے بھی روسیوں کی اس سرمایہ کاری

کے شاندار تعمیری اثرات کا اعتراف کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیمی میدان میں انقلاب حکومت کے غیر معمولی تعاون کے بغیر پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ پس جہاں ایک طرف زیادہ سے زیادہ طلبہ کو وظائف ملنے چاہئیں وہاں عام طلبہ پر بھی فیسوں وغیرہ کا کم از کم بوجھ ہونا چاہیئے۔ جو نظام تعلیم تعلیم کو مہنگا اور اس کے حلقہ کو محدود کرتا ہے موجودہ حالات میں وہ ملکی بقا اور اسکے استحکام کیلئے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ پس ہماری حکومت کو چاہیئے کہ تعلیم کو ہر ممکن حد تک سستا بنائے۔

۳ اصلاحات کا آغاز چھوٹی کلاسوں سے ہونا چاہیئے مثلاً آج ہمارے ملک میں مڈل یا میٹرک تک معیار تعلیم بلند کر دیا جائے تو وہ بعد میں دوسری ہائر کلاسز کا بوجھ آسانی سے سنبھال سکیں گے کیونکہ وہ ٹرینڈ ہو چکے ہونگے۔ مگر یکدم ایک ایسے آدمی پر جو صرف ایک من بوجھ اٹھا سکتا ہے تین چار من بوجھ لاد دینا ہرگز قرین انصاف نہیں اگر شروع سے ہی طلبہ کو تعلیم کے پہاڑی علاقوں میں جفاکشی کی تربیت دی جائے تو وہ اپنے مضبوط بازوؤں پر نسبتاً زیادہ بوجھ سہار سکیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اصلاحات کے باعث نیل ہونیوالوں کی تعداد میں اضافہ نہ ہوگا۔

۴ تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی کا مسئلہ بھی اصلاحات کے دوبارہ نفاذ سے پہلے ضرور حل ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ جو مالی پودوں کی مناسب دیکھ بھال اور صحیح آبپاشی ہی نہیں کر سکتا اسکی کوششوں سے شیریں پھلوں کی امید رکھنا بالکل عبث ہے۔ تعلیمی باغ کے مالی جنہیں "نئی کھاد" کے طریق استعمال سے واقف نہیں ہوتے اس وقت تک خطرہ ہے کہ وہ کھاد کو غلط استعمال کر کے پودوں کو تباہ کر کے ہی نہ رکھدیں پس ضروری ہے کہ کالجز وغیرہ کے موجودہ عملہ جات کو احیاء کا وقت آنے سے پہلے ہی ٹرینڈ کر لیا جائے اس کیلئے گورنمنٹ کو بھی تعلیمی اداروں کو سہولیات دینی پڑینگی اور اسے دینی چاہئیں۔ کیونکہ بالآخر اس کا فائدہ قوم کو ہی پہنچے گا۔ جاپان کی موجودہ ترقی اساتذہ کی تربیت پر کی ہوئی سرمایہ کاری کی ہی رہین منت ہے۔

۵ نصابی کتب کی کمیابی کا مسئلہ بھی احیاء سے پہلے حل ہونا چاہیئے تاکہ جونہی احیاء ہو طلبہ کو متعلقہ نصاب فوراً مہیا ہو جائے اور وہ اپنا وقت ضائع کئے بغیر اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن رہیں۔ ہم المنار کے ان کالموں میں پہلے بھی اس طرف کئی دفعہ توجہ دلا چکے ہیں۔ اوّل تو کتب ملکی علماء کے بورڈوں سے تیار کروانی چاہئیں یا اگر باہر سے ہی منگوانی ہوں تو ان پر درآمدی ٹیکس ہرگز نہیں لگنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بلیک مارکٹنگ روکنے کے لئے ہر بڑے شہر میں گورنمنٹ بک سٹال کھلنے چاہئیں۔ جو دوسرے بک سٹالوں کے پہلو بہ پہلو جائز اور مناسب داموں پر کتب مہیا کریں۔ اس طرح عام تاجران کتب طلبہ کو ایکسپلائٹ نہیں کر سکینگے

۶ دوبارہ نفاذ سے قبل ملک کے تمام بڑے شہروں میں فنی اور تکنیکی اداروں کا قیام بھی ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ جو طلبہ عام کالجز کی شرائط پوری نہ کر سکیں وہ ان اداروں میں تربیت حاصل کر کے ملکی ترقی کی دوڑ میں حصہ لے سکیں۔

۷ بورڈ اور یونیورسٹی کی موجودہ Bifurcation سکیم جاری رکھنی چاہیئے۔ اور جونہی یہ سکیم مکمل ہو جائے دوسری شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے فوراً قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کو دوبارہ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے۔

۸ تعلیمی اصلاحات کے احیاء کے متعلق یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت اس کے فوائد کی وسیع تر نشر و اشاعت کرے ریڈیو اور پریس کے وسائل کو اس ضمن میں پوری طرح استعمال میں لانا چاہیئے۔

حرف آخر:

حرف آخر کے طور پر ہم صرف یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ماہرین تعلیم کو نیا نظام تعلیم

پیش کرتے ہوئے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ نظامِ تعلیم بے شک معیاری ہو بے شک عالم اور سائنسدان پیدا کرنیوالا ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ سستا اور قابلِ عمل بھی ہو۔ کیونکہ ایسا کا معیاری ہونا ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا جبتک کہ وہ مناسب حد تک سستا اور کم خرچ نہ ہو۔ ہمیں امید ہے کہ ارباب حل وعقد ہماری ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔

ماہِ صیام - ایک امتحان

جس طرح مادی عالم میں امتحانات کا ایک سلسلہ ہے اسی طرح روحانی عالم میں بھی رُوح کی ترقی اور نشوونما کیلئے امتحانات رکھے گئے ہیں اور جس طرح مادی عالم میں ہم ایک امتحان پاس کرکے نچلے درجہ سے اوپر کے درجہ میں چلے جاتے ہیں اسی طرح رُوحانی عالم میں بھی انسان جب کوئی امتحان پاس کرتا ہے تو اس کی بصیرت قلب اور نورِ ایقان اللہ تعالےٰ کی معرفت میں ایک درجہ اوپر ہو جاتا ہے اور جس طرح تجربات اور امتحانات میں مسلسل کامیابی سے انسان اس دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرلیتا ہے اسی طرح عالم رُوحانیت میں بھی آزمائشوں اور ابتلاؤں میں استقلال اور صبر و ہمت کا مظاہرہ کرنے والے مکاناً علیاً کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

عالم رُوحانیت کے امتحانوں کا زیادہ حصہ عملی ہے۔

ہمارے مادی امتحانات اکثر و بیشتر نظریات کی بحث پر مشتمل ہیں۔ لیکن عالم روحانیت کے امتحانات زیادہ تر عملی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً اہلِ اسلام کے لئے ایک امتحان یہ ہے کہ وہ دن بھر میں پانچ نمازوں کی ادائیگی کا اہتمام کریں۔ اس امتحان کے تمام مراحل عملی ہیں وضو سے لیکر اختتام نماز تک عمل ہی عمل نظر آتا ہے۔ پھر ایتاءِ زکوٰۃ کا امتحان ہے یہ بھی خالصتہً عملی نوعیت کا امتحان ہے پھر ایک امتحان روزوں کا ہے اور اس فرصت میں ہم اسی امتحان کے متعلق قدرے تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔

اگرچہ قیام صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کے امتحانات مسلسل جاری ہیں اور روزہ کا امتحان صرف ایک ماہ کیلئے ہے لیکن یہ امتحان تمام امتحانوں سے مشکل ہے بلحاظ اپنے نصابِ امتحان کے اور تمام امتحانوں سے افضل ہے اس لحاظ سے کہ جو اس امتحان میں کامیاب ہوگیا اس نے گویا کئی امتحان پاس کرلئے اور وہ امتحان لینے والے کے خاص مقربین میں سے ہوگیا۔ کیونکہ اس امتحان میں شامل ہونے والوں کو اس نے بتا چھوڑا ہے کہ جو کوئی اس امتحان کے ذریعہ میری رضا تلاش کرے گا۔ تو وہ یاد رکھے۔ کہ کامیابی کی صورت میں مجھ سے براہِ راست جزا پائے گا۔

نصابِ امتحان:۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس امر کی بھی وضاحت کردی جائے۔ کہ وہ روزہ کس نوعیت کا ہے جس کا اجر خود خدا تعالیٰ ہے۔ اور اس کے ہر روزہ پر چہ کا نصابِ امتحان کیا ہے؟ سو واضح ہو کہ رمضان المبارک کا روزانہ پرچہ امتحان مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے:۔

پہلا امر یہ ہے کہ روزہ دار سحری سے لیکر غروبِ آفتاب تک ہر قسم کے اکل و شرب سے اپنے تئیں بچائے رکھے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ ہر قسم کی نفسانی خواہشات سے مکمل کنارہ کشی کرے نہ کبیرہ کے پاس جائے اور نہ صغیرہ کے پاس پھٹکے۔ ہر قسم کی بدنظری اور گالی گلوچ وغیرہ سے بچا رہے اور بُری محفلوں کا قصد نہ کرے۔

تیسرا امر قیام نماز ہے روزہ دار کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ نہ صرف پانچ وقت کی فرض نماز ادا کرے بلکہ نماز تہجد کا اہتمام بھی کرے اور حتی الوسع زیادہ سے زیادہ اوقات نوافل اور ذکرِ الٰہی میں بسر کرے۔

چوتھا امر یہ ہے کہ اس ماہ میں اللہ تعالےٰ کے ان بندوں کا خاص

خیال رکھے جو کسی وجہ سے محتاج اور بیکس ہیں اور حتی الوسع انکی مدد میں لگا رہے یعنی رمضان المبارک میں دستِ سخاوت کو زیادہ سے زیادہ کھلا رکھے تا روزِ قیامت خدا اس سے یہ سوال نہ کرے کہ میں بھوکا تھا تو نے مجھے روٹی نہ دی۔ میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہ دیا اور میں ننگا تھا تو نے مجھے کپڑا نہ دیا۔ بلاشک ہم میں سے بعض بعض کے لئے ذریعہ آزمائش ہیں۔ پس ہمیں خدا تعالیٰ کے ان بندوں کو جو کسی لحاظ سے غریب ہیں اپنے خاص دوست بنا کر رکھنا چاہیئے کیونکہ وہ ہمارا ذریعہ آزمائش ہیں اور ایک لحاظ سے ہمارے ممتحن ہیں اگر ہم انہیں خوش رکھیں گے تو وہ ممتحنِ اعلیٰ سے ہمارے لئے زیادہ نمبروں کی سفارش کریں گے۔

ایک عام روزہ دار کے لئے "امتحانِ صوم" میں کامیاب ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان امور میں کامیابی حاصل کرے۔

پانچویں امر کا تعلق ماہ صیام کے آخری عشرہ سے ہے اور وہ یہ ہے کہ رمضان المبارک کے آخری دس دن تمام دنیوی معاملات سے الگ ہو کر اللہ تعالیٰ کے گھر میں وہ کر ذکر و فکر میں گذارے جائیں اور یہ آزمائش نفس کشی کے لحاظ سے سب آزمائشوں سے زیادہ سخت اور تلخ ہے یہ شق ایسی ہی ہے جیسے عام امتحانوں میں "آنرز" کے امتحان کی شق ہوتی ہے۔

چھٹا امر، امر عمومی ہے اور اس کا تعلق تمام روزہ داروں سے بھی ہے اور معتکف روزہ داروں سے بھی۔ روزہ کا اصل مقصد لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ہے یعنی روزہ دار متقی بن جائے۔ متقی وہ ہے جس نے اپنے ہر ایک کام کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق کرنے کی کوشش کی اور اس کا دل ہر وقت اس کی نافرمانی سے ترساں رہا جس طرح اچھے طالب علم کو اپنے اصل حاصل کردہ نمبروں کے علاوہ ممتحن [illegible] دیدیتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے متقی پر زیادہ خوش ہو کر

(باقی دیکھیں ص۳۲ پر)

(بقیہ کالج کے شب و روز)

نے "ہستی باری تعالیٰ" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

مجلس اردو:۔ ایک مشاعرے کے علاوہ جسٹس ایس۔ اے جان اور جسٹس انوار الحق نے تقاریر کیں۔

مجلس عربی:۔ محترم مولانا ابو العطاء صاحب مدیر الفرقان نے "اسالیب القرآن" کے موضوع پر عربی میں تقریر کی۔

کھیلوں کے میدان میں۔

والی بال:۔ کالج کے ایک کھلاڑی عبد الجلیل صادق پنجاب یونیورسٹی کی ٹیم میں منتخب ہوئے۔ اور پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انٹر یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں شرکت کی۔

فٹ بال:۔ بورڈ کی ٹیم زون میں رنرز اپ رہی۔

روئنگ:۔ ہمارے کالج کی ٹیموں نے بورڈ اور یونیورسٹی میں اپنی رنرز اپ کی پوزیشن برقرار رکھی۔

باسکٹ بال:۔ بورڈ کی ٹیم رنرز اپ اور ڈگری ٹیم یونیورسٹی چیمپین قرار پائی۔ ایک آل پاکستان ٹورنامنٹ منعقد ہوا۔ جس میں ملک کی متعدد نامور ٹیمیں شریک ہوئیں۔

(بقیہ آپ کے خطوط)

ایک اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ "المنار" میں اردو ادب کے طلبہ بہت ہی کم لکھتے ہیں۔ مضمون نگار بالعموم دوسرے شعبہ جات سے ہی متعلق ہوتے ہیں۔ "ادب" والوں سے تو سائنس کے شعبہ جات کے طلبہ ہی زیادہ مستعد ہیں۔ کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اس جمود کی کیا وجہ ہے؟

مراسلہ کے "طویل" اور دردِ دل کے "شدید" ہونے پر معذرت خواہ ہوں۔

(خیر اندیش:۔ چوہدری ناصر احمد بی۔ اے۔ سال اوّل)

آپ کے خطوط

۱ گذشتہ سال کے "المنار" کے چند پرچے بالاستیعاب پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ المنار کے مطالعہ نے میرے دل پر کچھ تاثرات چھوڑے میں نے ضروری سمجھا کہ ان تاثرات کو آپ تک پہنچا دوں۔

۱۔ کئی کالجوں کے میگزین نظر سے گذرتے رہتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی آپ کا "المنار" ان سب میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے یہ کیسی خوشی کی بات ہے کہ کم از کم ایک کالج کا رسالہ ایسا بھی ہے جس میں تمام دنیوی مضامین بھی اسلامی قدروں کو ذہن نشین کر کے لکھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ المنار کی اس انفرادیت کو قائم رکھے۔ آمین۔

۲۔ یوں تو سبھی مضامین معیاری اور کافی اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کے "ایڈیٹوریل" مضامین تو غالباً اس پرچہ کی رُوح ہوتے ہیں۔ "اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ"۔ "ہمارا نصب العین۔ علم و عمل" کے مضامین بھی بہت پسند آئے!!

مخلص نذیر احمد خادم
سیکرٹری تعلیم الاسلام کالج یونین گھٹیالیاں ضلع سیالکوٹ

۲ "المنار" کا گذشتہ شمارہ نظر سے گزرا۔ سچ پوچھیے تو آپ نے تعلیمی اصلاحات پر ایک ٹھوس اداریہ لکھ کر ایک اہم معاملہ میں صائب رائے کا مضبوط طریق سے اظہار کیا ہے میرے خیال میں ہمارے کالج کے طلباء کو یہ رسالہ اٹھا کر ایک مرتبہ پھر یہ اداریہ پڑھنا چاہیئے۔ "دریائے منار کے نصف میں پہنچا تو ایک گرداب" میں پھنس گیا۔ میرا اشارہ آپ کے افسانہ کی طرف ہے "موجوں کی سیاحت" کی خوب روداد لکھی ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں کہ اگر افسانہ "ذرا اور" مختصر ہوتا تو اس کی رعنائی میں کافی اضافہ ہو جاتا اس لحاظ سے جناب زرتشت منیر احمد صاحب کا افسانہ جس کا نیا عنوان "ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا نہ ملا" رکھا گیا ہے۔ واقعی قابلِ داد ہے۔ کہ صفحے تو صرف دو استعمال کئے ہیں لیکن ندرتِ خیال کی چاشنی بھر دی ہے! "ناقابلِ فراموش" پڑھ کر مجھے بھی اپنے کئی ایسے واقعات یاد آ گئے جنکو ہم بھلا چکے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دوست کے دل یا جسم میں ابھی تک کوئی "درد" باقی ہوگا۔ جو یہ روداد صفحۂ قرطاس پر آ گئی۔ سیف الزمان کا افسانہ "کفرانِ نعمت" ایک تلخ حقیقت کا بیان ہے جس کے منتخب الفاظ نے اسکی تلخی کو اور بھی زیادہ کر دیا ہے اس کامیاب کوشش پر میری طرف سے مبارکباد پیش کر دیں۔ "المنار" کا حصہ نظم اچھا دلچسپ ہے اور باقی رہیں ہمارے اساتذہ کی نگارشات۔ تو ان پر کوئی تبصرہ کرنا ممکن ہے میرے لئے ممکن تو ہو لیکن نامناسب اور حفظ مراتب کی حدود سے تجاوز کرنے کے مترادف ہوگا۔ اللہ تعالےٰ ہمارے "المنار" کی کتابت کے "معیار" کو بھی بلند فرمائے تاکہ مضامین کا نکھار اور بڑھ نہیں سکتا تو کم از کم کم تو نہ ہو!

(عطاء المجیب راشد بی۔اے فائنل)

۳ کئی کالجوں کے میگزین پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے مگر صحتِ فکر اور پاکیزگی خیال کا جو لحاظ "المنار" کے کالموں میں رکھا جاتا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ملا۔ المنار کے اداریے نوٹ جس قومی سپرٹ اور ملی رُوح سے لکھے جاتے ہیں۔ وہ "روشنی اور رفعت کے نشان" کے تقاضوں کو بالکل پورا کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ یہ اندازِ فکر مبارک کرے۔ المنار کے افسانے بھی تعمیری ہوتے ہیں "رنگِ تغزل" بھی مبتذل جذبات کی پراگندہ خیالی سے پاک ہے ادارۂ المنار کی نظرِ انتخاب بجا طور پر قابلِ تعریف ہے۔ اب

؎ گر وہ بُرا نہ مانیں کچھ اور عرض کر دوں

(باقی دیکھو صفحہ ۳۲ کالم ۲)

پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم ۔ اے

طلبِ علم

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امّت کے ہر فرد کیلئے علم کا حصول فرض قرار دیا ہے ۔ چنانچہ فرمایا ؛۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ ۔

یعنی ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے ۔

یہاں علم سے مراد دراصل تو علمِ دین اور عرفانِ الٰہی ہی ہے ، کیونکہ اس کے بغیر انسان اپنی پیدائش کی غرض و غایت کو ہی حاصل نہیں کر سکتا ۔ لیکن طفیلی طور پر حسبِ استعداد و حالات باقی علوم بھی اس ارشاد کے تحت آجاتے ہیں ۔ کیونکہ دوسرے علوم بھی دراصل عرفانِ الٰہی میں محد اور معاون ثابت ہوتے ہیں بشرطیکہ انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کے تحت حاصل کیا جائے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ مومنوں کے متعلق فرماتا ہے ؛۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ
اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ
لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ
اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ
وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا
بَاطِلًا ۔ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ
النَّارِ ۔ (آلِ عمران : ۱۹۰ تا ۱۹۲)

ترجمہ ؛۔ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں عقلمندوں کیلئے یقیناً کئی نشان موجود ہیں ۔ وہ عقلمند جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ! تو نے اس عالم کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا تو (بے مقصد کام کرنے سے) پاک ہے ۔ پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا ۔

یعنی مومن دنیوی علوم اور سائنسی علوم حاصل کرتے ہیں اور پھر انہیں عرفانِ الٰہی کا ذریعہ بنا کر اللہ تعالیٰ کی خشیت میں اور بھی ترقی کر جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے عذاب سے بیش از پیش ترساں ہو جاتے ہیں ۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر کان دھرے اور اپنی زندگیاں حصولِ علم کے لئے وقف کر دیں ۔ سائنس کے علوم حاصل کئے اور تقویٰ میں بھی ترقی کی ۔ لیکن پھر فیج اعوج کا زمانہ آگیا ۔ جس کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لَیْسُوْا مِنِّیْ وَ لَسْتُ مِنْھُمْ ۔ کہ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں اور ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ لوگ خدا اور اس کے رسول

کے احکام کو چھوڑ دیں گے۔ قرآن کریم کو پس پشت ڈال دیں گے اور دین و دنیا میں ذلیل ہو جائیں گے۔ چنانچہ قرآن کریم نے خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان بعد میں آنیوالے مسلمانوں کی زبوں حالی کی یہی وجہ بیان کی ہے۔ فرماتا ہے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝

یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ اے میرے رب میری قوم نے اس عظیم الشان قرآن کو چھوڑ دیا تھا اسی لئے یہ دین و دنیا میں ذلیل ہو گئے۔

ایک زمانہ تھا کہ معلمین و متعلمین درس و تدریس کے مقدس مشغلے میں رضائے الٰہی کے حصول کیلئے اور اس کام کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے منہمک ہوتے تھے یا پھر اب یہ زمانہ ہے کہ بعض نے اس پاک مشغلے کو بھی بد دیانتی کا کاروبار بنا دیا ہے۔ مدارس میں داخلہ حصولِ علم کے لئے نہیں بلکہ سندات کے حصول کیلئے اور ان کے ذریعہ سے دنیوی مراتب حاصل کرنے کے لئے لیا جاتا ہے۔ بعض طلبہ کا مقصد صرف امتحان میں پاس ہونا ہوتا ہے نہ کہ حصولِ علم۔ اسی لئے وہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کے جائز و ناجائز ذریعے اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امتحان میں نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کمرۂ امتحان میں لکھی ہوئی تحریریں لے جانے اور پھر پکڑے جانے کی صورت میں جھوٹ بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی حال گو شاذ طور پر بعض اساتذہ کا ہے جو تحریری طور پر اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے بغیر کسی قسم کی رُو رعایت یا دباؤ قبول کرنے کے پرچے دیکھے ہیں، حالانکہ محض اپنے دنیوی اور چند روزہ تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے وہ بعض فیل ہونے والے طلبہ کو پاس کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے تعلقات جوڑنے کی خاطر اپنے خالق و مالک کے ساتھ تعلقات توڑنے کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ غور کا مقام ہے کہ کیا یہ امر خیانت میں داخل نہیں کہ یونیورسٹی تو انہیں انصاف اور دیانت کے ساتھ میزان قائم کرنے کے لئے مقرر کرتی ہے لیکن وہ میزان عدل کو قائم نہیں رکھتے اور ناجائز رحم کرتے ہوئے محض دنیوی تعلقات کی خاطر فیل ہونے والے طلبہ کو بھی پاس کر دیتے ہیں اگر یہ خیانت ہے اور ان کا دل بھی گواہی دیگا کہ یہ بددیانتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مدنظر رکھنا چاہیئے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ خواہ یہ خیانت امتحان میں نقل کرنے کی صورت میں ہو خواہ ایک فیل ہونے والے طالب علم کو پاس کر دینے کی صورت میں۔ بہرحال ہے تو یہ خیانت ہی۔

اس قسم کی حرکات سے دنیوی تعلقات تو استوار ہو جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار نہیں رہ سکتا۔ پھر جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے۔ بددیانتی کا ارتکاب بھی کرنا پڑتا ہے۔ ملک کے علمی معیار کو گرانے اور دنیا میں اپنے ملک کو ذلیل کرنے میں بھی حصہ دار بن جاتے ہیں۔ اعلیٰ معیار کے طلبہ کے ساتھ نالائق اور نااہل طلبہ کو پاس کر کے اس مصفّٰی معیار کو گدلا کر دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح ملکی یونیورسٹیوں کی وقعت کم کر دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ
يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (البقرہ: ۲۸)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے احکام کے ذریعہ سے بہتوں کو گمراہ ٹھہراتا ہے (یعنی پھر ان سے وہی سلوک کرتا ہے جو گمراہ لوگوں سے کیا جاتا ہے) اور بہتوں کو ان احکام کے ذریعہ سے ہدایت دیتا ہے لیکن ان احکام کے ذریعہ سے وہ نہیں گمراہ قرار دیتا مگر بدعہد لوگوں کو۔ جو اللہ تعالیٰ کے اور اس کے رسول کے ساتھ باندھے ہوئے) عہد کو اس کی پختگی کے بعد بھی توڑ دیتے ہیں اور اس (الٰہی) تعلق کو کاٹ دیتے ہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اُسے جوڑا جائے اور ملک میں فساد پھیلا دیتے ہیں۔ یہی لوگ (در اصل) گھاٹا اٹھانیوالے ہیں (حالانکہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ سراسر نفع مند کاروبار کر رہے ہیں)

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح ایک قومی خدمت بجا لا رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اس طرح نوجوان طلبہ کا وقت بچاتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس طریق سے ہمارے ملک کا علمی و عملی معیار گر جاتا ہے۔ نالائق اور بددیانت لوگ برسرِ اقتدار آجاتے ہیں اور ملک بدنام ہو جاتا ہے اور جب ہمارا ملک بدنام ہو تو ساتھ ہی ہم بھی اس بدنامی میں حصہ دار بنتے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صاف فرما دیا ہے۔ کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے والے ہی در اصل خسارہ میں رہتے ہیں۔

پس ان چند سطور کے ذریعہ سے مَیں پاکستان کے تمام طلباء و اساتذہ سے دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ آؤ ہم اپنے ملک کے علمی معیار کو بلند کریں۔ میزانِ عدل کو قائم کریں۔ علم کو علم کی خاطر پڑھیں نہ کہ ڈگریوں کی خاطر۔ علم کے حصول کو رضائے الٰہی کا ذریعہ بنائیں نہ کہ بددیانتی و جھوٹ کے ارتکاب کا۔ ہمارا سائنسدان سائنس کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرے۔ اور ساتھ ہی عرفانِ الٰہی میں بھی ترقی کرے اور بے اختیار پکار اُٹھے کہ رَبَّنَا فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ جی اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں کی وجہ سے ہمیں آگ میں نہیں ڈالیگا۔ ان لوگوں کو یہ احساس نہیں ہوتا۔ کہ انہیں آگ میں ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بددیانتیاں اور جھوٹ ہی وہ آگ کا عذاب ہیں جن میں وہ پہلے ہی پڑے ہوئے ہیں۔ دراصل عَذَابَ النَّارِ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے دوری کا نام ہے اس دنیا میں یہ عذاب وہ دُنیوی لذات کے نشوں کی وجہ سے محسوس نہیں کرتے لیکن عالمِ آخرت میں یہی بددیانتیوں کا ماحول یعنی اللہ تعالیٰ سے دُوری کی حالت جسے وہ اس وقت اپنے دل میں چھپائے پھرتے ہیں باہر کو ایک ماحول کی صورت میں انہیں گھیر لیگی اور اسی کا نام عذاب النار ہے لیکن روحانی اندھاپن کی وجہ سے وہ اس وقت اس آگ کو دیکھنے اور محسوس کرنے سے قاصر ہیں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي
الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۔

کہ جو اس دُنیا میں رُوحانی حقائق کو دیکھنے
سے اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی
ہوگا۔ بلکہ زیادہ گمراہ اور بھولا بھٹکا ہوگا۔

پس اے پاکستان کے ایسے طالب علمو! اور ایسے اساتذہ! کیا یہی اسلام ہے جس کے قیام کے لئے تم نے پاکستان حاصل کیا تھا؟ کیا تم اپنے ملک میں جھوٹ۔ کم علمی۔ علمی بد دیانتی اور جہالت کو فروغ دے کر خوش ہوتے ہوگے؟ کیا تم اپنے ذلیل دنیوی تعلقات کی خاطر خدا اور اس کے رسول کے قائم کردہ معیارِ تقویٰ کو چھوڑتے جاؤ گے؟

اب ایک آخری حربے کا ذکر کرنا بھی غیر مناسب نہ ہوگا جب بعض لوگوں کو ان باتوں کی طرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے رنگ میں توجہ دلائی جاتی ہے کہ ہمیں ان امور سے جو رُوحانی پاکیزگی اور دیانت کے خلاف ہیں مجتنب رہنا چاہیئے تو وہ نصیحت کرنے والوں میں عیب نکالنا شروع کر دیتے ہیں کہ تم بڑے پاکباز بنے پھرتے ہو۔ کیا تم میں یہ کمزوری نہیں وہ کمزوری نہیں۔

اب یہ بات تو درست ہے کہ پاک وہی ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ پاک کرے اور پاک ٹھہرائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کسی میں ایک کمزوری پائی جاتی ہے تو اسے دوسری کمزوری سے بچنے اور دوسروں کو بچانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ اگرچہ یہ امر درست ہے کہ اگر ایک شخص خود کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور دوسروں کو اس سے روکتا ہے۔ تو وہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کے وعید کے نیچے آجاتا ہے۔ لیکن یہ بہانہ کہ کیونکہ ہم پورے طور پر پاک نہیں اس لئے ہمارے لئے اب تمام کمزوریوں میں حصہ دار بننے میں کوئی حرج نہیں۔ قطعی طور پر ناقابلِ قبول ہے۔ اگر کسی کے سر میں درد ہو تو کیا ضروری نہیں ہوتا کہ وہ ایسی گندی غذا سے پرہیز کرے جو بیٹھنے کا موجب ہو سکتی ہو یا زکام کے محرکات سے بچے؟ پس اگرچہ یہ درست ہے کہ ہم میں سے بعض سو فیصدی روحانی صحت مند ہونے کے دعویدار نہیں اور بعض رُوحانی بیماریوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دوسری بیماریوں کو بھی معمولی سمجھیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں بچایا ہوا ہے۔ یا وہ ان بیماریوں سے دوسروں کو بچانے کی کوشش نہ کریں۔ الغرض پاکیزگی یا غیر پاکیزگی کا طعنہ دینا بھی شیاطین الجنّ والانس کا پرانا حربہ ہے جو اکثر نصیحت سننے پر یہ کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ کہ یہ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں۔ پس ہمیں ایسے لوگوں کے اقوال کی قطعی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ جس حد تک بھی ہمیں پاکیزگی حاصل ہے اُسے آگے وسیع کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ پھر نصیحت کرنے والے کی طرف نہیں بلکہ خود نصیحت پر غور کرنا چاہیئے کہ اس نصیحت میں حقیقت ہے یا کہ نہیں؟ پھر یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ حقیقی طور پر پاکباز کون ہے۔ پس حتی الوسع شیطان کے ہر قدم سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے خواہ چھوٹا قدم ہو یا بڑا۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ
بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَوْلَا
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ
مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا

وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ
وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (سورۂ نور)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو اور جو کوئی شیطان کے قدموں کی پیروی کرے گا (تو وہ یاد رکھے کہ) وہ بیحیائی کے اور ناپسندیدہ امور کی طرف ترغیب دیتا ہے (یعنی ان باتوں کو تمہاری نظروں میں خوشنما کر کے دکھاتا ہے) اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتے تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ (دعاؤں کو) خوب سننے والا اور (تمہاری نیتوں کا) خوب علم رکھنے والا ہے۔

اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ بعض والدین و اساتذہ لڑکوں کے مال بچانے، انہیں دماغی یا مالی نقصان سے بچانے کے لئے بعض ناجائز اعمال کر گزرتے ہیں۔ والدین تحریک کرتے ہیں اور اساتذہ ان کی ایسی تحریک کو تعلقات دنیوی کی خاطر قبول کر لیتے ہیں۔ دونوں ہی الٰہی امتحان میں یعنی خدا تعالیٰ کی آزمائش دیانت میں فیل ہو جاتے ہیں۔ ہم سب کا فرض ہے خواہ ہم اساتذہ ہوں خواہ طلبہ۔ خواہ ہمارے عزیزوں کو کیسے ہی مالی و دماغی نقصان کا سامنا ہو رہا ہو کہ امانت، دیانت اور سچائی کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں گناہوں سے بچا لیا ہے اس کا شکر کریں بقیہ امور میں بھی شیطان سے جنگ جاری رکھیں جس حد تک ہو سکے۔ تقویٰ شعار بنیں یعنی اپنی کسی روحانی کمزوری کا بہانہ رکھ کر اس امر میں تقویٰ کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ جس میں ہم دعا سے عزم اور استعانت الٰہی سے تقویٰ کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ خدا کے احکام کو سنیں اور ان کی اطاعت کریں اپنے عزیزوں اور اپنے اموال کی وجہ سے بجائے خدا تعالیٰ سے قطع تعلق پیدا کرنے کے انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔ اور خدا تعالیٰ کی خاطر ہمیں دنیوی تعلقات اور دوستیوں کو قربان کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کریں کیونکہ ہمارے نفسوں کے لئے انجام کار یہی بہتر ہے۔ اپنے نفس کے منافع اور بخلوں اور وساوس سے بچنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ حقیقی نفع وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔ اگر ہم ایسا کرینگے تو یقیناً بامراد و کامگار ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ
وَّاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا
وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ
وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (التغابن۔ ع ۲)

یعنی تمہارے اموال اور تمہاری اولادیں تو صرف تمہاری (روحانی و اخلاقی) آزمائش کا ذریعہ ہیں اور (جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کو مدنظر رکھے گا۔ وہ یاد رکھے کہ) اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے (پس اے مومنو! اپنی بعض کمزوریوں کی وجہ سے دوسری کمزوریوں پر دلیر مت ہونا یا انکو دنیا سے مٹانے کی کوشش سے مت رکنا بلکہ)

جس حد تک بھی تمہارے بس میں ہے اس حد
تک تو ضرور تقویٰ اختیار کرو (اور جس حد
تک تقویٰ اختیار کرنا تمہارے لئے ممکن نہیں
اس کے لئے خدا تعالےٰ سے استعانت کرو)
اور (اس کے احکام کو) سنو اور اطاعت
کرو۔ اور (اپنے اموال و اولاد کو اس کی
راہ میں خرچ کرو۔ یہی امر تمہارے نفسوں
کے لئے بہتری کا موجب ہوگا۔ اور جو لوگ بھی
اپنے نفس کی طرف سے پیدا کردہ بخل یا حرص
سے بچائے جائیں (تو وہ یاد رکھیں کہ) وہی
(حقیقت میں) فلاح اور کامیابی کا سند دیکھنے
والے ہیں۔

آخر میں اللہ تعالےٰ کے حضور عاجزانہ دُعا ہے کہ ہم سب کو
خواہ ہم اساتذہ ہوں یا طلبہ۔ اپنے فضل سے تقویٰ کے
قدموں پر استوار رکھے اور شیطان کے قدموں سے بچائے اور
ہمارا خاتمہ بالخیر ہو۔ اللہ تعالےٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم حصولِ
علم کے مقدس فریضے کو اس کی رضا کے لئے ہی بجا لائیں اور
اس مقدس کاروبار میں گندگی نہ اچھالیں۔ تا ہمارے ملک
کی اور ہماری قوم کی عزّت دنیا میں قائم ہو۔ اللہ تعالےٰ ہم سے
راضی ہو اور ہم اس سے راضی ہو جائیں۔

اَللّٰھُمَّ اٰتِ نَفْوُسَنَا تَقْوٰھَا
وَزَکِّھَا وَاَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا
وَاَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلٰھَا۔ وَاٰخِرُ
دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
اٰمِیْن یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ؕ

بانیٔ اسلامؐ سے غیر مسلموں کی عقیدت

(از سید محمود مجیب اصغر)

"کسی مذہبی معلم یا نبی کی صداقت کا اہم ترین معیار یہ ہو سکتا ہے۔ کہ دیکھا جائے وہ دنیوی مخالفتوں یا اپنے دوستوں کی خوشامد کے باوجود مستقل اور سو فیصدی اپنے اصول پر قائم رہا اور چونکہ محمد (صلعم) سے یہ غیر معمولی چیز ظاہر ہوئی اس لئے غیر مذاہب سے تعلق رکھنے والے لاکھوں انسان آپ کا نام عزت سے لیتے ہیں"

(لارڈ سنہا سابق نائب وزیر ہند)

زمرۂ اہلِ عشق میں اتنا تو امتیاز دے
عشق جو مجھ کو دے خدا عشقِ شہِ حجاز دے
جن کو ہے ناز کی ہوس ان کو ادا و ناز دے
میں ہوں ترا نیاز مند مجھ کو سرِ نیاز دے

(جناب امر چند قیس جالندھری)

"بُت پرستوں کے ملک میں اور ایک بُت پرست خاندان میں پیدا ہو کر خدا کی وحدانیت کا اظہار کوئی معمولی بات نہیں۔ ہزارہا قسم کے توہمات اور بت پرستی کی رسوم کو ترک کرا کر ایک وحدہٗ لاشریک خدا کی طرف تاریکی میں ٹھوکریں کھانے والی خلقِ خدا کو متوجہ کرنا ایک بہت بڑا احسان۔ ایک بہت بڑا کام ہے۔ جو حضرت محمد صاحب نے سرانجام دیا۔ اور ہر شخص جو خدا کی ہستی پر یقین رکھتا ہے اپنے پیارے خالق و مالک کی شان کو ظاہر کرنے والے حضرت محمدؐ کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا"

(پنڈت تارا چند صاحب)

عطاء المجیب راشد
بی ۔ اے (فاضل)

غزوۂ بدر

چند ایمان افروز واقعات

خالقِ کائنات اللہ تبارک و تعالیٰ کی خاص حکمت کے پیشِ نظر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ مختلف ادوار میں سے گذری۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کا ایک خاص پہلو وہ دفاعی جنگیں ہیں جو ہادیٔ برحق صلے اللہ علیہ وسلم کو ظالم کفار کے مقابلہ پر لڑنی پڑیں۔ کہنے کو تو یہ جنگیں تھیں اور جنگوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس وقت ہر ناجائز اور ناروا بات بھی قابلِ اعتراض نہیں رہتی۔ لیکن اگر واقعات کا بغور مشاہدہ اور تجزیہ کیا جائے تو اس دلکش کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں پنہاں تھی۔ محبت، اخوت، مساوات، عفو و درگذر اور ان جیسے جن لاتعداد زریں اصولوں کی تعلیم مسلمانوں کو زمانۂ امن میں دی جاتی تھی۔ ان کا عملی نمونہ میدانِ جنگ میں بھی جاری رہتا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع اور آسمانی نوشتوں پر یقینِ تام کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عزم و استقلال، شجاعت اور توکل علی اللہ کے ایسے بے نظیر نمونے صادر ہوتے جن کا حقیقی تصور آج بھی انسانی رُوح میں ایک خاص جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے اور ازدیادِ ایمان کا باعث بنتا ہے اسی خیال سے جب میں نے غزوۂ بدر کے واقعات کا جائزہ لینا شروع کیا تو ذہن پر چند نقوش اُبھرے جنہیں ذیل میں درج کرتا ہوں۔

۱

۱۲ رمضان المبارک سنہ ۲ھ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تین سو تیرہ فدائیوں کے لشکر کو لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اسلامی لشکر کی صورت یہ تھی کہ سارے لشکر میں صرف دو گھوڑے تھے اور ساٹھ زرہیں۔ سواری کے لئے ہر تین آدمیوں کے حصہ میں ایک اُونٹ آتا تھا۔ جس پر باری باری دو آدمی سوار ہوتے تھے۔ جب سواریوں کی تقسیم ہونے لگی تو حضورؐ کے دو ساتھیوں حضرت علیؓ اور ابو لبابہؓ کو شامل کر کے تینوں کو ایک اونٹ ملا۔ ان دونوں صحابہؓ نے ہر چند خواہش ظاہر کی اور اصرار کیا کہ صرف حضورؐ ہی اُونٹ پر سوار ہوں اور وہ دونوں پیدل چلیں گے۔ حقوق مساوات کے علمبردار نے جب یہ سنا تو فرمایا

"ما انتما باقوی منی ولا انا باغنی
عن الاجر منکما"

کہ جسم کے لحاظ سے تم دونوں مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو اور خدا تعالیٰ کے اجر کا میں تم سے کم محتاج نہیں ہوں۔

اللہ اللہ! کیا پاکیزہ قول ہے جو نبی کریمؐ کی زبان پر جاری ہوا۔ انکسار، مساوات اور فقیرانہ زندگی کی صرف تعلیم ہی نہیں دی۔ بلکہ قدم قدم پر خود اس کا عملی نمونہ دکھایا

آج جب ایک دنیاوی بادشاہ باہر نکلتا ہے تو تزئین و آرائش اور سواری کا اس قدر اہتمام کیا جاتا ہے کہ عقل

حیران رہ جاتی ہے لیکن تاجدار رسالت، فخرِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا نمونہ یہ ہے کہ اپنے لئے کسی نمود و نمائش اور دنیوی اہتمام کو پسند نہیں فرماتے۔

(۲)

جب سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کو کفار کے لشکر کی روانگی کا علم ہوا۔ تو حضورؐ نے روانگی سے قبل صحابہؓ سے مشورہ فرمایا۔ اس موقعہ پہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے ہر ممکن امداد کا وعدہ فرمایا۔ لیکن حضور صلے اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے برابر فرما رہے تھے کہ مجھے مشورہ دو۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اشارہ سمجھکر ایک انصار صحابی حضرت مقداد بن اسودؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا۔

"یا رسول اللہ! غالباً حضورؐ کا اشارہ انصار کے اس معاہدہ کی طرف ہے کہ وہ مدینہ کے اندر تو حضورؐ کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے لیکن شہر سے باہر جنگ کرنیکے ذمہ دار نہیں ——— یا رسول اللہ! یہ اس وقت کی بات ہے، جبکہ ہم نے حضورؐ کی عظمت کو نہ جانا تھا۔ میں انصار کی طرف سے دعوہ کرتا ہوں کہ ہم حضورؐ کے دائیں بھی لڑیں گے بائیں بھی لڑیں گے۔ حضورؐ کے آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن اس وقت تک حضورؐ تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک ہماری لاشوں کو روند کر نہ آئے۔ پھر کہا۔ کہ یا رسولؐ اللہ! ہم موسےٰ کے ساتھیوں کی طرح نہیں ہیں جنہوں نے کہا تھا:۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا
اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔

بلکہ ہم حضورؐ کی حفاظت کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادیں گے۔"

یہ عقیدت و فدائیت کا عہد محض زبانی نہ تھا ——— اوّل تو اس جوش و ولولہ سے عہد کرنا بھی کچھ کم ہمت نہیں چاہتا لیکن صحابہؓ نے بعد میں اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اسے حرف بحرف سچ کر دکھایا ——— ذرا اس واقعہ پر غور کیجئے کہ انہی صحابہ میں سے ایک صحابی کی لاش کے ٹکڑے ہو گئے تھے اور اس حالت میں ان کی بہن کے سوا کوئی ان کو پہچان بھی نہ سکا ——— لاریب یہ کام ان صحابہ کرام کا ہی ہے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے نور محمدیؐ کے جلوے دیکھے

(۳)

حریتِ ضمیر کا کچلنا موجودہ دور کا ایک عام مشاہدہ ہے رعایا کو حکمرانوں کے سامنے دم مارنے یا ان کی رائے سے اختلاف کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا دربار سب سے نرالا ہے کہ عظمت و مہابت انوار کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر لیکن آزادیٔ رائے اور بے تکلفی کا وہ ماحول کہ صحابہ ادب و احترام کے ساتھ دنیوی معاملات میں اپنی رائے بھی پیش کرتے ہیں۔ ذرا یہ واقعہ ملاحظہ ہو۔ کہ جب غزوۂ بدر کے موقعہ پہ حضورؐ نے لشکر کے پڑاؤ کے لئے ایک جگہ پسند فرمائی تو ایک صحابی منذر بن حبابؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا وحیٔ الٰہی میں ایسا حکم ہوا ہے اور جب حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں۔ یہ اپنی صوابدید ہے تو حضرت منذر بن حبابؓ نے اطمینان کر لینے کے بعد کہ یہ خدا کا حکم نہیں۔ باادب عرض کیا کہ جنگی تدبیر کے لحاظ سے اس جگہ کی بجائے فلاں جگہ زیادہ موزوں ہے ——— چنانچہ حضورؐ نے دوسری جگہ پڑاؤ فرمایا

۴

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہمیشہ عدل و مساوات کی تعلیم دیتے رہے۔ حضورؐ اس بات کا اہتمام فرماتے کہ تکلیف دینے والے کو صرف اتنی تکلیف ہی دے کہ مظلوم کی داد رسی کی جائے۔ ذرا یہ واقعہ ملاحظہ ہو۔ میدانِ جنگ میں صحابہؓ کا لشکر کھڑا ہے۔ حضورؐ ایک چھڑی سے صفیں سیدھی فرما رہے تھے کہ چھڑی ایک صحابی سواد بن غزیہؓ کے پیٹ میں لگی۔ نہ جانے سوادؓ کو کیا سوجھی۔ بولے "اگر خدا تعالیٰ نے آپؐ کو واقعی حق اور عدل کے لئے بھیجا ہے تو مجھے اس تکلیف کا بدلہ لینے کی اجازت دیجئے!" جب صحابہؓ کے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی تو اس گستاخانہ جرأت پر ان کا خون کھول اٹھا۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور ذرا وقفہ ہوتا تو وہ اس صحابی کو اس "گستاخی" کی سزا دیتے اور ممکن تھا کہ سوادؓ ہی میدانِ جنگ کا پہلا مقتول ہوتا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کر سکتے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا بطنِ مبارک سوادؓ کے آگے کر دیا۔ سواد کے پیٹ پہ اس وقت کوئی کپڑا نہ تھا۔ حضورؐ نے بھی پیٹ پر سے کپڑا اٹھا دیا۔ اور فرمایا "لو اپنا بدلہ لے لو" صحابہؓ وقت کی نزاکت کی وجہ سے دم بخود ہو گئے۔ قریب تھا کہ آپے سے باہر ہو کر سواد پہ جھپٹ پڑتے۔ عین اس وقت حضرت سوادؓ آگے بڑھے اور حضورؐ سے لپٹ گئے اور نورانی شکم کے بوسے لینے شروع کر دیئے۔ پھر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! جنگ در پیش ہے اس لئے میری تمنا تھی کہ زندگی کی آخری سعادت اس طرح حاصل کروں کہ حضورؐ کے بدن سے میرا بدن مس ہو جائے۔" محسنِ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم نے سوادؓ کو دعا دی اور فرمایا "اے سواد! تو کتنا خوش بخت ہے اور کتنی مبارک ہیں تیری یہ حیلہ سازیاں"

۵

جنگِ بدر کے موقعہ پر امیہ بن خلف کے قتل کا واقعہ ایک عجیب واقعہ ہے ان کا حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے کسی وقت معاہدہ ہوا کہ وہ مکے میں ان کی اور یہ مدینہ میں ان کی حفاظت کریں گے امیہ بھی اس جنگ میں آیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں امن کے ان معاہدات کا کوئی پاس نہیں کیا جاتا۔ خاص طور پر جبکہ جنگ کا موقعہ ہو اور معاہدہ بھی صرف دو شخصوں کے درمیان ہو لیکن نبی پاک صلے اللہ علیہ وسلم کے پیش فرمودہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی وجہ سے عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے امیہ کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھا۔ وہ اس کو لے کر ایک پہاڑ پر چڑھ گئے۔ حضرت بلالؓ کی نظر ان پر پڑ گئی۔ چند ساتھیوں کو آواز دے کر ان کی طرف لپکے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جب مقابلہ کی صورت نہ دیکھی تو اس کو لٹا کر اس پر اوندھے گر گئے تاکہ کسی طرح اس کی جان بچا کر اپنے عہد کو پورا کریں لیکن صحابہؓ نے ان کے نیچے سے تلواریں داخل کر کے امیہ بن خلف کو قتل کر دیا۔ اگرچہ عبدالرحمٰن بن عوف امیہ کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن ان کی کوششیں پابندیٔ عہد کے اس جذبہ کی غمازی کرتی ہیں جو ان کی روح میں رچ گیا تھا۔

۶

معرکۂ بدر میں صحابہ نے شجاعت و بہادری کے خوب جوہر دکھائے لیکن بچوں کا ذوق و شوق اور جوش و ولولہ بھی دیکھنے والا تھا جو بیت اصرار کر کے فوج میں شامل ہوئے۔ دو نوجوان مسلمان معاذ اور معوذ بھی اسلامی لشکر میں کھڑے تھے۔ جب انہیں مسلمانوں پر تنگی اور ظلم کا زمانہ یاد آیا تو جوش سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے پوچھا "چچا! وہ ابوجہل کہاں ہے جو حضورؐ کی شان میں گستاخی کیا کرتا تھا اور مسلمانوں کو دکھ دیا کرتا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ

کی روایت ہے کہ ابھی میں نے انگلی کے اشارہ سے ابوجہل کا پتہ بتایا ہی تھا کہ وہ دونوں عقاب کی طرح جھپٹے۔ اور تھوڑی دیر میں ابوجہل کی لاش خاک و خون میں تڑپ رہی تھی ـــــ جب یہ نوجوان کفار کے لشکر کی صفوں کو چیرتے ہوئے ابوجہل پر حملہ آور ہوئے تو ابوجہل کے چند عکرمہ نے ان پر پیچھے سے وار کیا جس سے معاذؓ کا بایاں بازو کٹ کر لٹکنے لگا۔ معاذؓ اسی حالت میں لڑتے رہے لیکن یہ دیکھکر کہ یہ بازو لڑنے میں روک بن رہا ہے۔ اسے اپنے پاؤں سے دبا کر الگ کر دیا ـــــ اس واقعہ پر غور کیجئے اور اس بے پناہ عشق و محبت کا اندازہ لگائیے کہ ہر ایک ایک مسلمان فرد کے دل میں اس برگزیدہ نبیؐ کے لئے تھی۔ کہ اس کی عزت اور حفاظت کی خاطر اپنے نفس کو بھی بھول جاتے تھے۔

۷

میدانِ جنگ میں ابھی لڑائی جاری تھی کہ حضورؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حکم دیا کہ وہ ابوجہل کی لاش کو تلاش کریں وہ صحابی تلاش میں نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ابوجہل ان دو بہادر مسلمانوں کے حملہ کی وجہ سے قریب المرگ ہو کر زمین پر گرا پڑا ہے اور درد سے سسکیاں لے رہا ہے ابن مسعودؓ تلوار لیکر آگے بڑھے تاکہ اس کا سر تن سے جدا کر دیں۔ اس بدبخت کافر کے دل سے ابھی تک تکبر اور غرور رخصت نہ ہوا تھا۔ بڑے تحقیر آمیز لہجہ میں بولا "او چرواہے! یہ کیا حرکت ہے"! لیکن جب دیکھا کہ اس صحابی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور اس کے ارادہ میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔ تو بولا "دیکھو اگر میرا سر کاٹنا ہی ہے تو گردن لمبی رکھکر کاٹنا تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ کسی سردار کا سر ہے ـــــ مرتے ہوئے بھی اس کو اپنی سرداری کے اظہار کا کس قدر خیال تھا لیکن حضرت ابن مسعودؓ جیسے مؤحد شخص کو ان باتوں کا کیا خیال تھا فرمایا کہ تیری بدبختیوں کا حق یہی ہے کہ تیری یہ آخری خواہش بھی پوری ہونے نہ دی جائے۔ یہ کہا اور گردن جڑ کے عین نیچے سے کاٹ کر سر حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا ـــــ یہ واقعہ بظاہر معمولی سا نظر آتا ہے لیکن ذرا غور کریں کہ ابن مسعودؓ کا ابوجہل کے ساتھ یہ سلوک کرنے کا سبب ان کی کوئی ذاتی دشمنی یا عداوت نہ تھی غصہ صرف اس بات کا تھا کہ یہ وہ بدبخت ہے کہ جو میرے آقا کو گالیاں دیتا تھا اُنؐ پر آوازے کستا تھا۔ تکلیف دہی کے کسی موقعہ سے نہ چوکتا تھا۔ اس کی اسلام دشمن سرگرمیوں کا خیال آتا تھا کہ ایک ہی لمحہ میں ان کی تلوار نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

۸

بدر کا میدانِ جنگ مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ مالِ غنیمت کے علاوہ بہت سے قیدی بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آئے۔ ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اگر مسلمان ان کی گردنیں اُڑانا چاہتے۔ تو ان کو کوئی روک نہ تھی لیکن حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا۔ اور فدیہ بھی وہ جو ہر ایک کی استطاعت کے مطابق تھا۔ جتنے دن یہ قیدی مدینہ میں رہے اگرچہ وہ قیدی تھے لیکن مسلمانوں نے حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ان سے کوئی انتقامانہ سلوک نہ کیا۔ ان قیدیوں کا اپنا بیان ہے کہ ہم میں سے جس کے پاس کپڑے نہ تھے ان کو کپڑے دیئے گئے۔ یہ مسلمان خود سوکھی کھجوریں کھا کر گذارہ کرتے تھے اور ہمیں روٹیاں کھلاتے تھے۔ اور جب ہم ندامت کی وجہ سے روٹیاں واپس کرنا چاہتے تو وہ انکار کر دیتے۔ اللہ اللہ یہ سلوک آج اس دنیا میں کہاں ـــــ یہاں تو یہ صورت ہے کہ جب تک قیدیوں اور مجرموں کا خون رس رس کر حکمرانوں

کی تشنہ لبی کو سیراب نہ کر دے، ان کی آتشِ انتقام ٹھنڈی نہیں ہوتی۔

۹

بدر کے قیدیوں میں حضورؐ کی صاحبزادی سیدہ زینبؓ کے شوہر ابوالعاص بھی شامل تھے۔ جب حضورؐ نے قیدیوں سے فدیہ طلب فرمایا۔ تو ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ انہوں نے حضرت زینبؓ کو مدینہ آنے کی اجازت نہ دی تھی۔ اور وہ مکہ ہی میں تھیں۔ جب ان کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے ان کا فدیہ خود بھجوا دیا۔ فدیہ کے اس مال میں انہوں نے وہ ہار بھی بھجوایا جو ان کو اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کے ترکہ میں سے ملا تھا۔ جب یہ سارا مال حضورؐ کی خدمت میں پیش ہوا اور نظر اس ہار پر پڑی تو رفیقۂ حیات حضرت خدیجہؓ یاد آگئیں جنہوں نے اپنا سب کچھ حضور پُر نور پر نثار کر دیا تھا۔

ذرا کشمکش کے اس منظر کا تصور کیجئے کہ ایک طرف اس بیٹی کی محبت جو مکہ میں رکی ہوئی تھی۔ وہ بیٹی اپنے خاوند کی رہائی کے لئے فدیہ دیتی ہے اور وہ قیمتی ہار بھی پیش کرتی ہے جو اس سیّدہ کے ترکہ میں ملا تھا جو حضورؐ کو اس سقفِ آسمانی کے نیچے سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ دوسری طرف عدل و انصاف کا تقاضا تھا کہ سب سے برابر کا سلوک کیا جائے۔ اگر حضور ذرا اس بات کا اشارہ بھی فرماتے کہ ہار واپس کر دینا چاہیئے۔ تو کون شخص تھا جو حضورؐ کی اس خواہش کی تعمیل سے انکار کر دیتا۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے فرمایا۔ کہ اگر صحابہؓ کی مرضی ہو تو یہ ماں کا ترکہ بیٹی کو واپس کر دیا جائے۔ سب صحابہ نے بیک زبان اتفاق کیا۔ ہار واپس کر دیا گیا۔ اور ابوالعاص رہا کر دیئے گئے۔ اور انہوں نے حضرت زینبؓ کو مدینہ جانے کی اجازت دیدی ــــ کوئی اور حکمران ہوتا تو جمہوریت اور عدل کے ان تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر دیتا۔ لیکن یہ فخرِ رسل صلے اللہ علیہ وسلم کا ہی خاصہ ہے کہ ہر مشکل سے مشکل مرحلہ پر بھی اسلامی تعلیمات کی بے نظیر امثلہ قائم فرماتے ہیں۔

۱۰

غزوۂ بدر حق و باطل کے درمیان پہلا معرکہ تھا جس میں حق کو فتحِ مبین اور باطل کو شکستِ فاش ہوئی اسلامی لشکر خوشی کے ترانے گاتا ہوا جب مدینہ کے قریب پہنچا۔ تو قاصد نے خبر دی کہ حضورؐ کی لختِ جگر ــــ حضرت عثمان غنیؓ کی رفیقۂ حیات ــــ صاحبزادی رقیہؓ رحلت فرما گئی ہیں۔ ان کی وفات کا صدمہ بہت جاں گداز تھا۔ لیکن قربان جایئے اس پیارے رسولؐ پر کہ جس نے اسے ذاتی صدمہ سے متاثر ہو کر قومی صدمہ نہ بننے دیا۔ بدر کی فتح کی قومی خوشی کو اس صدمہ سے متاثر نہ ہونے دیا۔

یہ چند واقعات تھے جو میں نے بیان کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیاتِ مبارکہ کے ہر واقعہ میں اسلامی تعلیمات کی ایسی پاکیزہ اور دلکش عملی تفسیر موجود ہے کہ پڑھ کر انسانی روح پر وجد سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

★ "وہ دن مبارک ہوگا جب پیغمبرِ اسلام کی برسی ہندوؤں کے گھروں میں بھی منائی جائیگی"

ــــ (لالہ رامچند منچندہ ایڈووکیٹ) ــــ

اقبال احمد نجم
بی۔اے (سال اول)

وبالوالدین احسانا

مجھے یاد ہے کہ جب ہمارے پڑوس میں ایک دفعہ ماں باپ اپنے بچے کو آوارہ گردی سے منع کر رہے تھے اور نماز پڑھنے کی تلقین کر رہے تھے۔ اس وقت اگر ایک درد مند دل رکھنے والا بیٹا ان دکھی والدین کی منتیں سماجتیں سنتا تو یقیناً وہ پسینہ میں شرابور ہو کر والدین کے قدموں میں گر پڑتا۔ اپنے کئے پہ نادم ہوتا اور آئندہ اطاعتِ والدین کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتا۔ لیکن اگر کسی بدبخت کے سینہ میں دل کی بجائے سنگ پارہ ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے!!!

بچہ پیدا ہوتا ہے تو کتنا معصوم ہوتا ہے! ماں کی چھاتیوں سے چمٹا شیر مادر پئے جاتا ہے۔ ماں پیار سے اس کے گال پر تھپکی دے کر چومتی اور دعائیں دیتی ہے۔ اے میرے راج دلارے تم بڑے ہو کر اسلام کی نیا کے کھیون ہارے بننا۔ دیکھو آج دشمنانِ اسلام محمد رسول اللہ کا تخت چھینا ہوا ہے تم جب بڑے ہو گے تو ان سے چھین کر اپنے پیارے آقا کے حوالے کرنا۔ وہ محبت سے گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے۔ اور بچہ ماں کی آنکھوں میں جھانک کر پھر ماں کے خون سے کشید شدہ دودھ پینے لگتا ہے۔ وہ پلائے جاتی ہے ایک حسین مستقبل کی امید میں۔ ایک باعثِ فخر بیٹے کے پیار میں وہ اپنی جان گھلاتی رہتی ہے۔ اور اس کا باپ اپنے خون پسینہ کی کمائی اپنے بیٹے پر نچھاور کر دیتا ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر ان کے لئے باعثِ راحت اور قوم کے لئے باعثِ فخر بنے۔ ملت کا مضبوط ستون اور خاندان کے لئے باعثِ عزت بنے۔ یہ جذبات ہوتے ہیں والدین کے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ ان کی جوانی ڈھل کر بڑھاپے کا روپ دھار لیتی ہے۔

تصور تو کیجئے۔ اگر انہیں نیک ماں باپ کا بیٹا معاشرہ میں نیکی کی بجائے بدی کا علمبردار ہو۔ ملت کی مضبوط عمارت میں تخریب کا موجب بنے۔ خاندان کی عزت کی بجائے ذلت کا سبب ہو۔ قوم کے لئے باعث افتخار ہونے کی بجائے باعثِ رسوائی ہو تو ان ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔ انہوں نے اپنے دل میں پیدا شدہ جذبات کے ایک بیج کی آبیاری کی جو بچے کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھ کر تناور شجر بن چکا تھا۔ اگر یہ شجر محبت خلوص اور راستی کی بجائے نفرت، بغض، گمراہی اور ذلت کے پھل دینے لگے تو سوچئے ماں باپ کے نازک دل کیا تڑپ کر نہ رہ جائیں گے۔ لاجرم ان کی امید و بیم کی نیا ساحل کو چھونے سے قبل ہی منجدھار میں پھنس کر ڈوب جائیگی ان کی مسرتوں کا تاج محل دھڑام سے زمین پر آ رہے گا۔ اُف! ان کے نشیمن پر ان کی نظروں کے سامنے بجلی گر جائیگی!! اس وقت وہ جلتے ہیں۔ کڑھتے ہیں۔ چیختے ہیں اور پند و نصیحت کی پُر درد صدا بلند کرتے ہیں۔ اے کاش! کوئی خوش قسمت کان دھرنے کی طاقت پائے۔ آخر وہی بیٹا جوان ہوا۔ تو

سگریٹ پینے لگا۔ گالیاں بکنے لگا۔ بدمعاشوں کا دوست فکر چوریاں کرنے لگا۔ ماں باپ نصیحت کرتے تو جھڑک دیتا۔ پھر اس کے والدین بھی حسرتوں اور یاس و الم کی کشتی میں بیٹھکر رخصت ہو جاتے ہیں تو اس وقت جب بیٹا پیشہ ور بدمعاش بن کر پولیس کی حراست میں آچکا ہوتا ہے تو انہیں یاد کرتا ہے اور چلاتا ہے کہ کاش وہ ان کی سُنتا تو اس کال کوٹھڑی میں نہ ہوتا جہاں شیطان بھی آتے ہوئے گھبراتا ہے۔ وہ بھی خوش جاتے تو ہم بھی اس کے وجود سے نالاں نہ ہوتی۔ کاش وہ دوستوں کی خوش گپیوں کو والدین کی نصیحتوں پر ترجیح نہ دیتا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ والدین کی نافرمانی کرتا تھا۔ اور زندگی کی حسین وادی میں کانٹوں کی پروا کئے بغیر قدم مارتا تھا۔ افسوس وہ اپنے ماں باپ کو بھی خوش نہ کر سکا۔ اور خدا بھی اس سے ناراض ہو گیا۔ اگر وہ اپنے مذہب کو جانتا اور خدائی احکام کو ترجیح دیتے ہوئے والدین کی نافرمانی نہ کرتا۔ تو کبھی اُسے شرمندگی نہ اٹھانا پڑتی۔

اے ہمدردانِ دینِ متین!! اسلام کا مفہوم ہی اطاعت و فرمانبرداری ہے یعنی ہر نیکی کی اطاعت کی جائے اور ہر بدی کی مذمت۔ لہٰذا اسلام نے یہ سبق سکھایا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے۔ انہوں نے بچپن میں تکالیف اٹھا کر تمہیں پالا۔ تمہیں چاہیئے۔ کہ تم ان سے اسی طرح پیش آؤ جیسے وہ تمہارے بچپن میں تم سے سلوک کرتے تھے۔ وہ تمہاری ضدیں سنتے اور برداشت کرتے تھے تم ان سے ترشی بھی دیکھو تو برداشت کرو۔ یہ تو بدلا نیکی کا بدلہ مگر احسان کا مطلب تو یہ ہے کہ کسی نے جتنی نیکی کی ہو اس کے سوا بڑھکر نیکی کی جائے ہر ایک کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے۔ کہ والدین کے حقوق ادا کرتا ہے یا نہیں بعض صغر سنی کی وجہ سے والدین کیا حساسات اور اپنے فرائض کو نہیں سمجھتے۔ وہ نہیں جانتے کہ والدین کو آجکل کے معاشی بحران سے دوچار معاشرہ میں اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے کس قدر دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ان پڑھ والدین سے معمولی قیمت کی شے کا نام لے کر رقم کثیر کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً لکھ دیتے ہیں کہ میں نے ڈکشنری خریدنی ہے اس ماہ سو روپے زائد بھیجیو۔ اب ان پڑھ غریب باپ کیا جانے کہ ڈکشنری کس بلا کا نام ہے وہ بچے کی پڑھائی کا خیال کرتے ہوئے بڑی دقت سے مطلوبہ رقم ادھار لیکر یا نہ معلوم کس اور طریقے سے بھیجے گا۔ اگر طلباء مذہب اسلام سے پوری طرح واقف ہوں تو والدین کو دھوکا دینے کی جرأت کبھی نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (احقاف ع ۲)

ترجمہ:۔ اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے احسان کی تعلیم دی تھی۔ کیونکہ اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں اٹھایا تھا۔ اور پھر تکلیف کے ساتھ اس کو جنا تھا۔ اور اس کے اٹھانے اور اس کے دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگے تھے۔ پھر جب یہ انسان کامل جوانی یعنی چالیس

سال کو پہنچ گیا تو اس نے کہا۔ اے میرے ربّ! مجھے اس بات کی
توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر
اور میرے ماں باپ پر کی ہے۔ (اور اس بات کی بھی توفیق دے)
کہ میں ایسے اچھے اعمال کروں جن کو تو پسند کرے اور میری اولاد
میں بھی نیکی کی بنیاد قائم کر۔ میں تیری طرف جھکتا ہوں اور
میں تیرے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں۔ (نیز ملاحظہ ہو سورۃ
نمل ع۲ ۔ سورۃ عنکبوت ع۱، سورۃ لقمان ع۲، بقرہ ع ۲۰۔
آل عمران ع ۳، ۱۸)

محولہ بالا آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو تاکیدی حکم سنایا ہے۔ کہ وہ والدین سے نیک سلوک کرے۔ پھر اس کی والدہ کی مختلف حالتوں کا نقشہ کھینچ کر انسان کو سمجھایا ہے کہ اس کی ماں نے اس کے لئے کتنی تکالیف برداشت کیں اسے چاہیئے کہ اگر اسے والدہ کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ بھی برداشت کرے۔ کیونکہ وہ اسے اپنے دودھ سے پالتی رہی یہاں تک کہ وہ تنومند ہوگیا۔ پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ نیک لوگوں کا شعار تو یہ ہے کہ جب وہ جوان ہوتے ہیں تو نہ صرف اپنے والدین کی فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر بھی ادا کرتے ہیں۔ اور دعاؤں کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں۔ اس آیت میں بالواسطہ والدین کے لئے بھی نصیحت ہے کہ وہ اولاد کے سامنے اپنا نیک نمونہ پیش کریں تاکہ ان کی اصلاح ہو اور دعاؤں پر زور دیں۔ پھر ہمارے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ "ماں کے قدموں تلے جنّت ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ والدہ کی فرمانبرداری سے جنّت تک رسائی ہوسکتی ہے اور اس کے علاوہ خدا کے رسولؐ نے خدا کی خوشنودی کا دارومدار باپ کی خوشنودی پر رکھا ہے۔

"رَضَاءُ الرَّبِّ فِی رِضَاءِ الْوَالِدِ
وَسَخَطُ الرَّبِّ فِی سَخَطِ الْوَالِدِ"

(ترمذی باب الفضل فی رضاء الوالدین)

پھر ترمذی میں ہی مروی ہے کہ ایک بار رسول کریمؐ کے ایک صحابی نے آپؐ سے عرض کی۔ کہ یا رسول اللہ! لوگوں میں سے میری رفاقت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے۔ تو حضور پُر نور نے فرمایا۔ اُمُّكَ ۔ یعنی تیری ماں۔ اس صحابی نے پھر دہرایا۔ یا رسول اللہ! اس کے بعد کون؟ تو آپؐ نے پھر یہی جواب دیا۔ اُمُّكَ ۔ تیری ماں۔ صحابی کے تیسری بار استفسار پر بھی آپؐ نے یہی فرمایا۔ پھر چوتھی بار جب اس نے عرض کی کہ والدہ کے بعد پھر کون۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ "ثُمَّ اَبَاكَ" کہ والدہ کے بعد تیری رفاقت کا سب سے زیادہ مستحق تیرا باپ ہے۔ اسی امر کی طرف خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک نہایت ہی لطیف اشارہ فرمایا ہے۔ جس سے والدین کی اطاعت کا طریق واضح ہوجاتا ہے:۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ
الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ
اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ؕ
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ
وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ؕ

(بنی اسرائیل ع۳)

ترجمہ:۔ تیرے ربّ نے اس بات کا تاکیدی حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور (نیز یہ کہ) اپنے ماں

باپ سے اچھا سلوک کرو۔ اگر ان میں سے کسی ایک پر یا ان دونوں پر تیری زندگی میں بڑھاپا آجائے تو تو انہیں (ان کی کسی بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے) اُف تک نہ کہہ اور نہ ہی انہیں جھڑک اور (ہمیشہ) ان سے نرمی سے بات کر۔ اور رحم کے جذبہ کے تحت ان کے سامنے عاجزانہ رویہ اختیار کر اور (ان کے لئے دعا کرتے وقت) کہا کر (کہ اے) میرے رب! ان پر مہربانی فرما۔ کیونکہ انہوں نے بچپن کی حالت میں میری پرورش کی تھی۔

متذکرہ بالا احکام الٰہی و احادیث نبویؐ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ والدین کا درجہ خدا اور اس کے پیارے رسول کی نظر میں کتنا بڑا ہے اور خدائی احکام کی بجاآوری اور اطاعت رسول ہر سچے مسلمان کا فرضِ اولین ہے۔ اس لئے ہمیں ماں باپ کے نازک احساسات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ اور زبان سے اُف تک نہیں کہنا چاہیئے۔ اور چہرہ سے کوئی آثار ناراضگی کے ظاہر نہیں ہونے دینے چاہئیں۔ مبادا وہ سمجھیں کہ بیٹے کو تکلیف ہورہی ہے۔ بلکہ اپنے والدین کے لئے اگر ہمیں تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں کیونکہ یہ وہی ماں باپ تو ہیں جو ہمیں بچہ ہونے کی حالت میں آرام دینے کی خاطر سوکھی جگہ پر لٹاتے تھے اور آپ گیلی جگہ پر لیٹ رہتے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ والدین تمہارے لئے دوزخ بھی ہیں اور جنت بھی۔ دوزخ اس طرح کہ جب تم انہیں دُکھ دوگے نافرمانی کروگے تو دوزخ میں جاؤگے اور اگر فرمانبرداری کروگے تو جنت میں اعلیٰ مقام حاصل کروگے بالآخر میں اپنے مضمون کا خاتمہ اس قرآنی دعا پر کرتا ہوں رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ آمین۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

" آپؐ عرب کے فرزندِ اعظم تھے۔ آپؐ یتیمِ اعظم تھے آپؐ نے غربت و مسکینی کا قدرت سے حصۂ وافر پایا تھا۔ گو آپؐ قبیلۂ قریش کے ایک نہایت شریف خاندان سے تھے تاہم قوم قریش کے اکابر خاندانوں کے مقابلہ میں غریب خاندان سے تھے حکمتِ الٰہی نے آپؐ کو جائداد جدی سے کچھ نہیں دیا تھا اور نہ آپؐ اپنے وارثوں کے لئے دنیوی مال و دولت چھوڑ کر گئے۔ یہ ایک زکھی حقیقت ہے کہ آپ یتیم و غریب ہو کر دنیا میں رُونما ہوئے اپنی زندگی کی ۲۳ سالہ خدمات سے اپنے تابعین کو عرب کے مالک و مختار بنا گئے مگر اپنے پیچھے اپنے وارثوں کو دنیوی مال و دولت میں سے ایک کوڑی بھی نہ دیگر گئے " (ریورنڈ پادری غلام مسیح)

" ہر ایک ریفارمر نے دنیا میں آکر بہت کچھ کیا۔ مگر حضرت محمد صاحب نے دنیا پر اس قدر احسان کئے جن کی مثال نہیں ملتی۔ عرب قوم جس جہالت میں گری ہوئی تھی اور کام، کرودھ، موہ، ہنکار میں پھنسی ہوئی تھی خیال تھا کہ یہ کبھی نہیں اٹھ سکتی مگر حضرت محمدؐ صاحب کی تعلیم کا اثر سمجھ لو یا آپؐ کی رُوحانی طاقت کی شکتی کہہ لو کہ اس مُردہ قوم میں جان پڑ گئی اور نہ معلوم حضرتؐ نے ان میں کیا پھونک دیا کہ وہ جنگلی دنیا کے بادشاہ بن کر بنی نوع انسان کو تہذیب کا سبق دینے لگے " (بھگت سائیں داس ایڈوکیٹ)

مٹادی بُت پرستی حضرتِ احمدؐ نے دنیا سے
سنائی دے رہا سلم کے گھر سے شورِ وحدت ہے
تمیزِ نسل و رنگ و قوم سب تونے مٹادی ہے
ترے افرادِ امت میں محبت ہے اخوت ہے
سمجھتے ہیں مسلماں جان کو اب کھیل دنیا میں
دلوں میں پھونک دی حضرت نے وہ روحِ شجاعت ہے
(سردار گوربخش سنگھ صاحب) درسالطیف شہزاد)

مقبول ملک
بی۔اے (سال اوّل)

خیالات کی دنیائیں

پہلی رات کا چاند نکل آیا تھا۔ میں مغرب کی نماز کے لئے گھر سے باہر نکلا تو نئے چاند کو فضائے آسمانی پر چمکتا دیکھکر دُعا کے لئے کھڑا ہوا۔ اور مسنون عربی دُعا پڑھی جس کا مطلب ہے :۔

اے خدا! تو اس نئے چاند کو میرے لئے ازدیاد
ایمان اور سلامتی کا موجب بنا"

اس کے بعد میں مغرب کی نماز کی ادائیگی کے لئے قریبی مسجد میں چلا گیا۔

تین چار روز کے بعد جب میں پڑھنے کے لئے بیٹھا۔ تو اچانک میری نظر چاند پر پڑی جو کہ برآمدے کی جالی میں سے مجھے اپنے دیدار کا موقع فراہم کر رہا تھا۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور کچھ نئے خیالات نے میرے دماغ میں جنم لیا۔ میرا دماغ مجھے آج سے چودہ سو سال پہلے کے تاریک زمانے میں لے گیا جبکہ ساری عرب قوم اور باقی دنیا جہالت کے عمیق گڑھے میں گری ہوئی تھی فساد اور جُوا ان کی گھٹی میں رچا ہوا تھا۔ اور انسانیت وہاں دم توڑ رہی تھی۔ ہر ایک شخص حد درجہ کی خود غرضی، تنگ نظری اور تعصب میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسی تاریکی اور ضلالت کے زمانے میں۔ ہاں اسی جاہلیت اور ظلم کے زمانے میں خدائے رحمٰن کو اپنے بندوں کی حالت پر رحم آیا۔ اس دفعہ کچھ اس طرح سے رحمتِ الٰہی جوش میں آئی۔ کہ اس نے اپنے سب سے پیارے اور مقرب بندے کو دنیا میں بھیجنے کا فیصلہ فرمالیا۔ تاکہ وہ دُنیا کو روحانی مائدہ فراہم کرے جس کی وہ متلاشی تھی۔ آپ کوثر کے وہی ساغر انہیں پلائے جس کی وہ پیاسی تھی۔ چنانچہ وہ مبارک دن آپہنچا اور رحمۃ للعالمین حضرت سرور کونین محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم قریش کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح پہلی رات کا چاند طویل انتظار کے بعد طلوع ہوتا ہے چالیس سال کے ہوئے تو خدا کا پیغمبر اور رسول ہونے کا دعویٰ کیا۔ وہ قوم جو آپ پر جان چھڑکتی تھی۔ آپؐ کو صادق اور امین جیسے عظیم القاب سے یاد کرتی تھی۔ آنکھ جھپکنے میں مخالف ہوگئی۔ ایسی زبردست مخالفت ہوئی کہ روئے زمین پر اس کی مثال موجود نہ تھی۔ پھر بھی خدا کا یہ بہادر جرنیل مصیبتوں اور طوفانوں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ہجرت کا حکم ہوا۔ دشمنوں نے اسے مدینہ یعنی دارالہجرت میں بھی سکھ اور چین سے نہ رہنے دیا۔ لیکن اب آپ کا لایا ہوا دین ـــــ دین اسلام بھی پہلی رات سے چودھویں کے چاند میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور عالم روحانی میں پوری آب و تاب سے اپنی کرنیں پھیلا رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ خدا کی مشیت کے مطابق تھا جس کے آگے کسی کا بس نہیں چل سکتا تھا۔ اسلام نے اس بہادر جرنیل کے زیر کمان دشمنوں پر فتح پائی۔ اور ہجرت کے چند سال بعد ہی مسلمان پھر پوری شان و شوکت سے مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ اسلام کا روحانی چاند

فضائے عرب پر پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔ جس کی پُر نور شعاعوں نے سارے عرب کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

اپنا کام کر چکنے کے بعد انسانیت کے یہ عظیم محافظ (فداہ نفسی) داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ کے لئے یہ وقت بڑا پُر ملال تھا اور ہوتا بھی کیوں نا۔ ان کی متاعِ عزیز اُن سے چھن گئی تھی۔ تاہم انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے لائے ہوئے مشن کا بیڑا اٹھانے کا تہیہ کر لیا۔ نظامِ خلافت جاری ہوا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں اسلام دُنیا کے دُور دراز ملکوں یعنی مراکش سے لیکر چین تک پھیل گیا۔

اسلام کا یہ چاند پوری آب و تاب سے چمکتا رہا۔ مگر افسوس صد افسوس، خلافت کا یہ بابرکت نظام مسلمانوں میں زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد خلافت بادشاہت میں تبدیل ہوگئی۔ اسلام کے اس نورانی چاند پر ہلکے ہلکے غبار چھانے لگے۔ تاہم اسلام کا محافظ خدا "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کے وعدہ کے مطابق ہر صدی کے سر پہ ایک مجدّد بھیجتا رہا جو اسلام کے رُخِ تاباں سے ہر قسم کے غبار کو دُور کرنے میں کوشاں رہے اور فکر و عمل سے خدا کے لائے ہوئے رسولؐ کے پیغام کی مشعل روشن کرتے رہے لیکن مسلمانوں کے اندرونی خلفشار کچھ اسطرح سے بڑھ گئے تھے کہ ان کی حالت روز بروز تنزّل کی طرف جا رہی تھی۔ باہمی اختلافات اور غداریوں کی بدولت ان کا علم و دولت اور جاہ و حشمت دنیا سے مفقود ہو چکے تھے۔ عیسائیت اپنا جال مضبوطی سے مضبوط تر کر رہی تھی۔ اور سمجھتی تھی کہ اسلام کا یہ چاند جلد ہی غروب ہو جائے گا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دُعائیں ضائع نہیں جا سکتی تھیں۔ خدا نے اپنے وعدہ کے مطابق چودھویں صدی ہجری کا مصلح اعظم بھیجا۔ اس کے آنے کے ساتھ ہی تاریکی کے بادل ایک ایک کر کے چھٹ گئے۔ تاریکی کے دھندلکے اسلام کے چاند نما چہرہ سے دُور ہونے لگے۔ روحانی ترقی تو الگ ہی مادی ترقی کے راستے بھی کھل گئے۔ جہاں روحانی ترقی کے لئے خدا تعالیٰ نے اس صدی کو مصلح اعظم سے سرفراز فرمایا۔ وہاں دنیاوی ترقی اور سیاسی تربیت کے لئے اس نے سر سید احمد خاں، علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح جیسے عظیم انسان پیدا کئے۔ ان سب نے ملّتِ احمدؐ میں ایک نئی رُوح اور ایک نیا جذبہ موجزن کر دیا۔ مسلمانوں کی منجمد رگوں میں پھر حرارت پیدا ہونے لگی۔ اور وہ روحانی اور سیاسی میدانوں میں ترقی کرنے لگے۔ جہاں رُوحانی لحاظ سے انہوں نے عیسائیت کے سنہرے خواب کو تار تار کر دیئے، وہاں سیاسی لحاظ سے بھی انہوں نے ایک علیحدہ قوم ہونے کا نعرہ لگایا۔ اور ایک علیحدہ نظریۂ حیات رکھنے کی بدولت انہوں نے پاکستان حاصل کر لیا۔ پاکستان حاصل ہو چکا، اپنی زندگی کی پندرہ منازل طے کر چکا۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے محافظ بنیں۔ اور اس کی بدولت دُنیا کو اسلام کا پیغام علم و عمل کی صورت میں پہنچا دیں۔

ملک کے تمام بہی خواہوں، خواہ وہ طالب علم ہوں یا استاذ، سائنسدان ہوں یا صنعت کار، افسر ہوں یا ماتحت، کا اوّلین فرض ہے کہ وہ وقت کی آواز پر کان دھریں اور گوشِ ہوش سے سُنیں کہ ان سے کیا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یاد رکھیئے، ہم نے وقت کا ساتھ دینا ہے، وقت ہمارا ساتھ نہیں دیگا۔ ہم نے بہت سا وقت خوابِ غفلت میں گزار دیا

لیکن خدا تعالےٰ نے ہم پر فضل کیا اور ہماری حالت پھر سے بہتر ہو گئی۔ لیکن اگر ہم نے اس کی نعمتوں سے پُورا پُورا فائدہ حاصل نہ کیا۔ اور اپنی کوتاہیوں کا ازالہ نہ کیا تو یاد رکھیئے، آئندہ نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے دائرہ میں ایک چھوٹے چاند کی حیثیت رکھتا ہے جُوں جُوں ہم خدا اور اس کے رسُول کی ہدایات پر عمل کرینگے اس چاند کی روشنی بڑھتی جائے گی۔ یہاں تک کہ ساری دنیا اس روشنی کی لپیٹ میں آجائے گی۔ پھر اس روشنی کی بدولت دنیا سے جنگ و جدال کا خوف مٹ جائے گا۔ اور صلح و آشتی کا دَور دَورہ شروع ہو جائیگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ العزیز۔

دربارِ نبوی کے انمول موتی

چوہدری غلام رسول آشنا بی۔ اے۔ فاضل

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اعتقادات عبادات معاملات، عادات، مہلکات، منجیات، احسانیات، ریاضات، تہذیبِ نفس، تہذیبِ قوم وغیرہ کے متعلق بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی افضلیت اور اسلام کی بزرگی کا مدار اسی تعلیم پر ہے۔ اس میں سے اس جگہ صرف تھوڑا نمونہ پیش کرتا ہوں۔

★۔ دانا وہ ہے جو خواہش کو ذلیل اور مابعد الموت کے لئے نیک عمل کرتا ہے اور نادان وہ ہے جو خواہش کا تابع ہو کر خدا پر امیدیں باندھتا ہے۔

★۔ پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دیتا ہے بلکہ وہ ہے جو اپنے نفس کو مغلوب کر لیتا ہے۔

★۔ قناعت ایسا خزانہ ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا۔

★۔ غیر ضروری کا چھوڑ دینا عمدہ دینداری ہے۔

★۔ مشورہ، امانت ہے یعنی غلط مشورہ دینا بھی خیانت ہے۔

★۔ شر کا چھوڑ دینا بھی صدقہ ہے۔

★۔ حیا سراپا خیر ہے۔

★۔ صحت اور فراغت ایسی نعمتیں ہیں جو ہر ایک کو میسر نہیں۔

★۔ متوسط اور درمیانہ روی سے گذران کرنا بھی آدھی کمائی ہے۔

★۔ عقل سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔

★۔ تدبیر سے بڑھ کر کوئی دانائی نہیں۔

★۔ جو عہد کا پابند نہیں وہ دیندار نہیں۔

★۔ مرد کا حُسن و جمال اس کی فصاحت ہے۔

★۔ جہالت سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں۔

★۔ جس میں امانت نہیں اس میں اخلاص نہیں۔

★۔ حسنِ خلق کے برابر محبت کیلئے کوئی تدبیر نہیں۔

★۔ جس طرح سرکہ سے شہد خراب ہو جاتا ہے اسی طرح بدخلقی سے سب اوصاف زائل ہو جاتے ہیں۔

★۔ اپنے بھائی کو شماتت نہ دو۔ مبادا خود بھی اس حالت میں گرفتار ہو جاؤ۔

★۔ تواضع سے درجہ بلند ہو جاتا ہے۔

★۔ خدا کی خوشی باپ کی خوشی میں ہے اور خدا کا غضب باپ کے غضب میں ہے۔

★۔ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہ کیا جائے گا۔

(باقی دیکھیں صفحہ ۳۳ کالم ۲)

آفتاب احمد بی۔اے فائنل

نوعمر فاتح

سندھ وہ سرزمین ہے جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ "وہاں کا پانی اور پھل بے مزہ ہیں - اور چور دلیر ہیں - اگر فوج کم ہو تو ضائع ہو جائے اور اگر زیادہ ہو تو بھوکی رہ جائے"۔ اگرچہ کافی عرصہ تک مسلمان اس علاقہ کو اپنی تحویل میں لینے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن ولید کے زمانے میں ایک کم سن مگر پُرجوش مجاہد کا معمولی سی فوج کے ساتھ دو سال میں کامیاب ہو جانا، اسلامی تاریخ کا ایک زریں باب ہے -

اموی خلیفہ ولید کا دور فتوحاتِ اسلام کا ایک سنہرا دور ہے اور اس دور کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانے میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں کا قدم جما - وہاں کل ملک کی آبادی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئی -

مشرق میں چینی ترکستان اور سندھ سے لیکر مغرب میں مراکش تک وہ ممالک ہیں جن کو آج اسلامی ممالک کہا جاتا ہے۔ ان دُور افتادہ ممالک کے فاتح ولید ہی کے سپہ سالار تھے - مغرب میں موسیٰ بن نصیر نے پورا افریقہ فتح کیا اور اس کے نائب سالار طارق بن زیاد نے جبل الطارق پر اُتر کر بجلی کی سی تیزی سے پورے اُندلس کو فتح کر لیا۔ مشرق میں وسطِ ایشیا میں قتیبہ بن مسلم کی تلوار چمک رہی تھی جس کے سامنے تُرک و تاتار خس و خاشاک کی طرح اُڑ رہے تھے۔ اُدھر سندھ میں محمد بن قاسم ۷۱۲ء میں دیبل پر حملہ آور ہوا - اور ۷۱۴ء میں ملتان فتح کر کے اس نے انتہائی فرض شناسی کی مثال قائم کرتے ہوئے اپنی اس عظیم الشان مہم کو ختم کیا۔

سندھ کا حکمران راجہ داہر، اس وقت کے حالات کے مطابق ہندوستان میں سب سے زیادہ طاقتور راجہ تھا - وہ ایک مدبر، تجربہ آزما اور باشعور حکمران تھا۔ محمد بن قاسم کے حملہ سے قبل اس نے آس پاس کے تمام ہندوستانی راجاؤں میں اتحاد پیدا کر لیا تھا۔ اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک امورِ مملکت سمجھنے والے باجبروت راجہ کو ایک نوعمر سالار نے ایک قلیل ترین قوت سے کس طرح شکست دی کہا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم کو بہترین مشیروں سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا۔ مرکز سے براہ راست حجاج بن یوسف کی ہدایات وغیرہ اس کی کامیابی کی ضامن تھیں - یا اس کی اس غیر معمولی کامیابی کو اس کی خوش قسمتی پر محمول کیا جا سکتا ہے بعض کا خیال ہے کہ اس وقت سندھ کی سیاسی بدامنی نے محمد بن قاسم کی مدد کی۔ - اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ محمد بن قاسم کی کامیابی اس کے غیر معمولی دماغ کی سنجیدہ تدبیروں اور عملی اقدامات کا نتیجہ تھی۔

جنگی حکمتِ عملی اور عسکری داؤ پیچ سے وہ پُوری طرح واقف تھا۔ حجاج بن یوسف نے اس سے قبل دو تین مہمیں مختلف جرنیلوں کے زیرِ کمان بھیجیں مگر ناکام رہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ راجہ داہر کوئی معمولی حکمران نہیں تھا محمد بن قاسم کا اس عمر میں ایک طاقتور راجہ کو شکست دینا

اس کی عسکری ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ نیز حجاج بن یوسف جو کہ ایک مدبّر اور قابل سیاستدان تھا۔ اس کا تقرر کوئی معمولی نہ تھا۔

سندھ کے ریگستان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حجاج نے فوج کا وہاں کی ضرورت کے مطابق انتظام کیا۔ سپاہیوں کو سوئی دھاگے سے لیکر سر کے میں بھیگی ہوئی روٹی تک فراہم کی گئی۔ جہاں تک اسلحہ کا تعلق ہے عربوں کے پاس دو ہی ہتھیار تھے۔ ایک نفط اور دوسرا منجنیق۔ لیکن فوج کی تعداد بہت کم تھی۔ اس کے مقابلہ میں اہل سندھ کے پاس کثیر تعداد میں زرہ پوش سوار اور پیدل فوج تھی۔ راجہ داہر مسلمانوں کے حملہ سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے پہلے سے ہی مکمل تیاری کر لی تھی۔ جگہ جگہ بہترین قلعے تعمیر کئے۔ چال یہ تھی کہ عربوں کو تھکا تھکا کر اندرونِ ملک میں دھکیل دیا جائے، اور پھر گھیر کر ختم کر دے۔

راجہ کا خیال تھا کہ عربوں کا دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر دیبل کے سامنے ہی خاتمہ ہو جائے گا۔ دیبل ایک مضبوط قلعہ تھا اور سب سے پہلے اس کا ختم کرنا ضروری تھا۔

محمد بن قاسم سے قبل جو مہمیں بھیجی گئیں ان کا یہیں خاتمہ ہوا۔ سندھ حکمتِ عملی یہ بھی تھی کہ اپنے سپہ سالاروں کو بہر صورت بچایا جائے۔ داہر کے مرجانے کے بعد اسکے بیٹے جے سنگھ اور گوپی ملک کے چپّے چپّے کے لئے بڑی سے بڑی فوجوں کے ساتھ جم کر لڑتے رہے اس کے باوجود محمد بن قاسم کو اس پوری مہم میں ایک مقام پر بھی شکست نہیں اٹھانی پڑی۔ اس کو ہر معرکہ میں دشمن کی بے انتہاء اور کثیر التعداد فوج سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور ہر معرکہ میں دشمن کو عبرت انگیز شکستیں دیکر بڑھتا چلا گیا۔

ملتان کے عظیم معرکہ کے بعد محمد بن قاسم کا اصل ارادہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا تھا اور اس مقصد کے لئے اس نے تیاری شروع کر دی اور اس کی افواج اُدھے پور تک پہنچ گئیں۔ اور قنوج کے راجہ کو دعوتِ اسلام دی جا چکی تھی۔ کہ ۹۵ھ میں حجاج کا انتقال ہوا۔ اور اس کے چند ماہ بعد خلیفہ ولید بھی راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

خلیفہ سلیمان نے اندرونی دشمنی کی بنا پر محمد بن قاسم کو معزول کر دیا۔ محمد بن قاسم کا آخری کارنامہ اس کی وہ بے مثل اطاعت ہے جبکہ اس نے مرکز کے حکم کی تعمیل میں خود کو گرفتار کرا لیا۔ اور اسی حصول کے لئے جان تک دیدی۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس سترہ سالہ مجاہد نے اپنی زندگی کے صرف دو سال ہندوستان کے اولین اسلامی مقبوضہ کو قائم کرنے میں کس طرح صرف کئے۔ اس کا ہر سانس عمل اور ہر عمل عبادت تھی۔ محمد بن قاسم کی نوعمری اور بظاہر ناتجربہ کاری ایک طرف اور اس کی اس مہم میں دور اندیشی اور پختہ کاری دوسری طرف انسان کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

محمد بن قاسم نے لوگوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا، جس کو دنیا کی اور کوئی تاریخ شاید ہی پیش کر سکے۔ اس کے حسنِ سلوک اور اعلیٰ تدبّر کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جب اس نے ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے پاس پچاس ہزار ہندی نومسلموں کی فوج تھی۔

محمد بن قاسم کی جنگی حکمتِ عملی، بروقت تدبّر اور فنونِ سپہ گری میں جہاں حیرت انگیز ہے اور اس کے انہی اوصاف نے راجہ داہر کے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ "ایک سترہ سالہ نوجوان کی سرکردگی میں جو فوج بڑھتی چلی آ رہی ہے اس کی میرے سامنے حقیقت ہی کیا ہے"۔

جیلانی کامران
ایم۔ اے۔ آنرز

"ادب اور بنیادی انسانی اقدار"

آج سے ڈیڑھ دو برس پہلے ادب اور انسانی اقدار کے باہمی رشتے کو تلاش کرنے والا شخص اس زمانے کے علمی ماحول میں شاید اجنبی نظر آتا۔ کیونکہ اس زمانے کی فکری فضا انسانی اقدار کے احترام اور اقرار سے پیدا ہوتی تھی۔ انسانی اقدار نہ صرف ادب بلکہ انسانی تعلقات کی مختلف تفصیلوں میں بخوبی نظر آتی تھیں۔ لوگ انہیں ادبی انجمنوں کی بحث و تمحیص میں تلاش نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک انسانی اقدار ہمیشہ قائم رہنے والی صداقتوں میں سے ایک صداقت تھی۔ لوگ صبح و شام اپنا چلن کچھ اس طرح وضع کرتے تھے کہ ان کے افعال انسانی اقدار کی علامت بن جاتے تھے۔ وہ نیکی کے سائے میں اپنی بہت سی کمزوریوں کے ساتھ جیتے تھے لیکن جب بھی خواہش کرتے تھے نیکی کے انعام ہی کی خواہش کرتے تھے۔ اے خدا! ہمیں سیدھے راستے پر چلا! اور جب کبھی یہ خواہش کسی گہری اذیت اور جستجو میں گرفتار ہو جاتی تھی۔ اس وقت وہ ایک ایسے اسم کی تلاش میں بے تاب ہوئے گوشوارے میں پیدا ہوتی، پھیلتی اور بکھرتی ہوئی نظر آتی تھی۔

ادراک کا تخلیق کیا ہوا ادب انسانی اقدار کے جاننے پہچاننے رشتے کو پیش کرتا تھا!

تاہم جہاں تک ادب اور بنیادی انسانی اقدار کے باہمی رابطے کا تعلق ہے اس سوال کا پوچھنا کہ بنیادی انسانی اقدار کیا ہیں؟ سراسر غیر مناسب ہے کیونکہ ہر شخص اپنے ضمیر کے سامنے اس سوال کا جواب بخوبی دے سکتا ہے اور ہر شخص اس حقیقت سے ناواقف بھی نہیں ہے کہ وہ رابطے کیا ہیں۔ جن کے ساتھ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ اور پھر کائنات کے ساتھ اور بالآخر اس ہمہ گیر قوت کے ساتھ وابستہ ہے جسے شاعری میں محبوبِ حقیقی کہتے ہیں۔ اگر ادب میں انہی جوابات کو دہرایا جائے تو ادب فن کی حدود سے باہر نکل کر غیر ادبی علوم کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے لہٰذا ادب اور بنیادی انسانی اقدار کے باہمی رابطے کا مسئلہ خالصتہً ادبی ضرورتوں اور رشتہ بندیوں کا مسئلہ ہے یعنی ہمارا مقصد اقدار کی تفہیم سے ذرا کم ہے اور اس رابطے سے زیادہ ہے جو بنیادی انسانی اقدار ادب سے قائم کرتی ہیں

کہانیوں میں اس نوع کا رابطہ نہایت کامیابی سے قائم ہوتا ہے اور ایک ایسے زمانے میں جب انسانی اقدار کی اہمیت ہر کسی کو تسلیم تھی۔ اس رابطے کی پیشکش بھی کچھ زیادہ آسان تھی۔ کہانی کہنے والا کسی داستان کے شہزادے کو چن لیتا تھا۔ اور پھر اسے پرفیند واقعہ کرکے اسے خواب کے ذریعے کسی انوکھی دنیا میں پہنچا دیتا تھا جہاں اشیاء کی شکل و صورت زمینی مشابہت سے بہتر دکھائی دیتی تھی۔ یہ دنیا شہزادے کو

اپنے حسن پر فریفتہ کر لیتی تھی اور وہ اس دنیا کی تلاش میں نکل پڑتا تھا۔ راستے میں اسے کئی قسم کے لوگ ملتے تھے اور آخر اسے کسی بزرگ کی رہنمائی حاصل ہو جاتی اور وہ اس دلفریب دنیا کا پتہ پوچھتا جسے اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ مجھے اسی دلفریب دنیا کی تلاش ہے۔" شہزادہ کہتا۔

"اے میرے عزیز! (بزرگ جواب دیتا) یہ دنیا اس پرند کے وسیلے کے بغیر نہیں مل سکتی جسے سیمرغ کہتے ہیں۔ اس دنیا کو پانے کی اصل شرط سیمرغ کی تلاش ہے۔۔۔"

یہ سُنکر شہزادہ سیمرغ کی تلاش میں کھو جاتا۔

وادیوں کے بعد وادیاں اور بیابانوں کے بعد بیابان گزرتے۔ مگر سیمرغ کہیں بھی دکھائی نہ دیتا۔ البتہ مختلف جنگلوں میں رہنے والے کئی پرندے شہزادے کے ساتھی بن جاتے۔ جہاں شہزادہ رکتا۔ پرندے رُکتے اور جب شہزادہ سو جاتا۔ پرندے اس کی حفاظت کرتے اور جب وہ پھر چلنے لگتا۔ پرندے اس کے ساتھ ساتھ اُڑتے۔

اے شہزادے! (پرندے پوچھتے) تو کس کی تلاش میں برسوں سے پریشان ہے؟"

شہزادہ جواب میں کہتا۔ "مجھے سیمرغ کی تلاش ہے کیونکہ جب میں اسے پالوں گا مجھے وہ دنیا مل جائے گی جس کے لئے میرا جیون چھن چکا ہے۔۔۔۔۔ اے کاش!"

اتنا سنتے ہی پرندے قطاروں میں رک جاتے اور کہتے "ہمیں دیکھ! کیا ہم تیس نہیں ہیں؟"

شہزادہ انہیں دیکھتا اور گنتا۔ اس پر یہ راز کھل جاتا۔ کہ سیمرغ یہی تیس پرندے ہیں۔ اور کوئی بھی پرندہ ایسا نہیں ہے جو سیمرغ کے نام سے موسوم ہو۔ اس موقع پر زمین کا رنگ بدلنے لگتا اور وہی دنیا شہزادے کے اردگرد رونما ہونے لگتی ہے جسے اس نے کئی سال پہلے خواب میں دیکھا تھا۔

میں نے جس کہانی کا اوپر ذکر کیا ہے اس میں عمداً تصرف کیا گیا ہے اور اس طرح داستانوں اور پرندوں کی کہانیوں کے اجزا سے مرتب ہوئی جس حکایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُسے سیمرغ کی حکایت کہا جا سکتا ہے اس حکایت کا تذکرہ اس لئے لازمی ہے کیونکہ بنیادی انسانی اقدار کا ادب سے براہ راست رشتہ صحیح نتائج پیدا نہیں کرتا۔ اور یہ بات بھی اپنی جگہ ثابت ہے کہ ادب بنیادی انسانی اقدار کا ترجمان ہے۔ ان دونوں صورتوں کی موجودگی میں سیمرغ کی حکایت کی کئی طرح تاویل کی جا سکتی ہے کیونکہ تاویل ہی کے ذریعہ اس حکایت کا مافی الضمیر ظاہر ہو سکتا ہے

میں سر دست ایک ہی تاویل پہ اکتفا کرتا ہوں اور وہ مذہبی زاویۂ نظر کے مطابق ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ادب کی تشریح اور تاویل صرف مذہبی زاویہ نظر ہی سے ممکن ہوتی ہے تاویل کے کئی ایک انداز ممکن ہیں مگر سیمرغ کی علامت ایک ایسا ادبی کرشمہ ہے جسے صرف فریدالدین عطار[1] اور داستانوں کے زمانے کے مزاج ہی کے حوالے سے جانچا اور سمجھا جا سکتا ہے اس زمانے کی تنقیدی فضا ادب اور انسانی اقدار کے باہمی رشتہ کو پختہ کرنے کی تمام تر ذمہ داریاں قبول کرتی تھی لہٰذا یہ کہنا کہ سیمرغ کے پیچھے کوئی علامتی حقیقت نہیں ہے۔ غلط ہوگا۔ داستان کا پھیلاؤ عمداً تیس پرندوں کی کہانی میں بدل جاتا ہے اور کہانی کے مرکزی کردار شہزادے کو سیمرغ کی تلاش میں عمداً مامور کیا جاتا ہے۔

---

[1] فریدالدین عطار منطق الطیر ۱۲۳۵ء

سیمرغ اس لحاظ سے انسانی اقدار کے مجموعے کی ایک ایسی ہمہ گیر علامت بن جاتا ہے جس کے ذریعے ایک ایسی دنیا ظاہر ہوتی ہے جسے زمین پر دن کاٹتے ہوئے لوگ بہت کم دیکھ پاتے ہیں اور جب اس دنیا کی کوئی شکل ان کے خواب میں رونما ہوتی ہے تو وہ اسے آنکھوں سے دیکھنے اور حاصل کرنے کیلئے بے تاب ہو جاتے ہیں لیکن جو بات قابلِ غور ہے یہ ہے کہ اس زمانے کا شاعر اپنے عالمگیر استعارے کی تشریح اور تاویل نہیں کرتا۔ مفہوم اور مطلب کو قاری کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ آزادی قاری کو حکایت کا مفہوم تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ تیس پرندوں سے آخر مراد کیا ہے؟ اور پھر تیس پرندوں کے حوالے سے سیمرغ کی علامت کا ظاہر ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے اور پھر تیس کے ہندسے سے کیا مراد ہے؟ یہ سوچ اسے مذہبی تصورات کی طرف لے جاتی ہے اور وہ خدا کی کتاب کے تیس پاروں کو تیس پرندوں کا مصداق قرار دیتا ہے۔ جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر "کلام اللہ" کی علامت بن جاتے ہیں۔ یوں سیمرغ "کلام اللہ" کی علامت بن جاتا ہے اور جو بات واضح ہوتی ہے یہ ہے کہ زندگی کو بہشت میں بدلنے کے لئے سیمرغ کی موجودگی لازمی ہے۔ کلام اللہ کے بغیر زندگی اپنے تکلیف دہ ظاہری طمطراق سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اور اس بہشت کو حاصل نہیں کر سکتی جسے انسان صرف تنہائی میں محسوس کرتا ہے۔ اور شہزادے کی مانند تلاش کرنے کے لئے دشت و بیابان میں نکل پڑتا ہے۔ یوں شہزادہ بنی نوع انسان کی ترجمانی کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا بہشت کی علامت بنتی ہے اور سیمرغ اس عہد نامے کی نشاندہی کرتا ہے جو انسان اور کائنات کے مصور اور خالق کے درمیان موجود ہے۔

(۲)

اس حکایت سے جو بات ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ شاعر نے ادب اور انسانی اقدار کی باہمی رشتہ بندی کو پیش کرتے ہوئے انسانی اقدار کی وضاحت نہیں کی۔ اور نہ اس سوال کا جواب دیا ہے کہ انسانی اقدار کون کون سی ہیں؟ اس نے سارے مسئلے کو سیمرغ کی علامت پر ختم کر دیا ہے اور انسانی اقدار کو اس علامت کے ذریعے کلام اللہ سے وابستہ کر دیا ہے اور کہا ہے کہ انسانی اقدار وہی ہیں جو سیمرغ کی علامت میں ہیں اور سیمرغ ان تیس اجزاء سے مرتب ہوتا ہے جنہیں خدا کی کتاب کے تیس پاروں کی صورت میں پہچانا جا سکتا ہے۔

ہر چند کہ یہ حکایت انسانی اقدار کی مکمل طور پر نہیں کرتی۔ تاہم داستان کے رنگ میں ایک بہتر دنیا خبر ضرور دیتی ہے۔ کہانیوں اور داستانوں میں بہتر دنیا" کی بے شمار صورتیں ہیں۔ قصۂ حاتم سے لے کر "طلسم ہوشربا" تک اور لوک کہانیوں سے لے کر مثنوی سحر البیان تک اس بہتر دنیا کی صورتیں کئی طرح آشکار ہوتی ہیں لیکن ان مختلف صورتوں کا بیان ایک سا رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اصل دنیا میں جو باتیں دکھائی نہیں دیتیں وہ اس بہتر دنیا میں بخوبی موجود ہوتی ہیں اصل دنیا میں انسان مجبور اور بے دخل ہوتا ہے لیکن داستانوں کی بہتر دنیا میں اس کی آزادی میں کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ تقدیر اور زمانہ دونوں کی دسترس سے باہر اس کی رسائی میں ہر شے آجاتی ہے اور وہ ایک ایسی غیر مرئی شکل اختیار کر لیتا ہے جسے اس جسم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا جس کے ساتھ وہ اصل

دنیا میں چلتا پھرتا اور زندگی کے دن گذارتا ہے۔ داستانوں کی بہتر دنیا اس لحاظ سے زندگی اور جسم سے حاصل کی ہوئی آزادی اور رہائی سے پیدا ہوتی ہے اس دنیا میں نہ تو اصل انسانی زندگی داخل ہوسکتی ہے اور نہ وہ جسم داخل ہوسکتا ہے جو زندگی کے مسئلے کا ایک انتہائی لازمی جزو ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم بنیادی انسانی اقدار کی طرف آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی اقدار کی فہرست میں جس کا نام بنیادی اہمیت کا ہے وہ آزادی کے لفظ سے موسوم ہے۔

بنیادی انسانی اقدار میں سے بڑی قدر آزادی ہے۔

اس بات سے اختلاف کی گنجائش غالباً بہت کم ہے کہ انسان دنیا میں ایک پیچیدہ صورت حال میں قید ہے۔ یہ صورت حال جسم اور تقدیر — ان دو جابر قوتوں کے اقتدار سے پیدا ہوتی ہے۔ تقدیر سے بیماری۔ حادثے اور موت رونما ہوتے ہیں اور جسم کے ذریعے وہ سارے تقاضے ظاہر ہوتے ہیں جن سے زندگی کی کہانی مرتب ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقدیر کی قوت بھی جسم ہی کی بدولت کارگر ہوتی ہے۔ انسان میں اگر کوئی اور بات قابل تعریف نہیں تو یہ قابل تعریف ضرور ہے کہ وہ مغلوب ہوکر جینا پسند نہیں کرتا۔ ساری شاعری اور سارا نثری ادب، سیاسی تاریخ اور فلسفہ اس خواہش کے اظہار سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان رسومات، قیود، پابندیوں اور سیاسی اور ذہنی غلامی، وقت اور مقام اور بالآخر اپنے جسم سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اس کی شاید وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا شعور اپنے وجود سے اخذ کرتا ہے اور اس کا وجود تب تک اپنے طور پر ظاہر نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ سارے بوجھ جو اسے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں ایک ایک کرکے اس سے الگ نہیں ہوجاتے۔ وہ اپنے آپ کی پہچان نہیں کرسکتا۔ انسان کی صحیح پہچان اس کی آزادی میں ہے۔

جس بنیادی انسانی قدر کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے وہ زمین پر انسان کے احساسِ وجود کی ضامن ہے۔ اس کے بغیر انسان کائنات میں اپنا مقام دریافت نہیں کرسکتا اور وہ رشتے بھی اس کی رسائی میں نہیں آتے جو اسے کائنات کی غیر فانی حقیقتوں سے منسلک کرتے ہیں۔ جب یہ انسانی قدر ظاہر ہوتی ہے اس وقت انسان اپنے احساسِ وجود کے ذریعے اپنے محلِ وقوع کا جائزہ لیتا ہے اور اپنے معاشرے، تہذیب، زمانے اور کائناتی نظام میں اپنا مقام تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے اس مقام کی تلاش ہی میں اس کی زندگی کا سارا مقصد مضمر ہوتا ہے۔ شاعری میں یہ تلاش مختلف انداز میں پیش ہوتی رہی ہے معاشرے اور سیاست کی ذیل میں اس تلاش کے ذریعے ترقی پسند تحریک، ادب اور اقبال کی شاعری پیدا ہوئی۔ کائناتی نظام میں انسان کے مقام کو تلاش کرنے کی کوشش نے سلطان باہو۔ بلھے شاہ اور خواجہ غلام فرید کی تخلیقات کو ظاہر کیا۔ اور زمانے اور وقت کے ضمن میں وہ ادب پیدا ہوا جس میں داستانیں، قصے، کہانیاں اور نثر کے ناول شامل ہیں جس ادب کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ احساسِ وجود سے رونما ہوکر جس قدر کو اپنا رہبر بناتا ہے وہ نیکی کی قدر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ "نیکی" کا مفہوم مختلف حالتوں میں مختلف رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ساری انسانی کارگذاری نیکی ہی کے نام سے انجام پاتی ہے اور جتنی بھی تحریکیں تصورات کی دنیا میں ظاہر ہوتی ہیں نیکی سے ہی منسوب ہوتی ہیں۔

بنیادی انسانی اقدار میں آزادی کے بعد نیکی کا نام آتا ہے!

اس موقع پر آپ شرر کے ناولوں کے بارے میں وضاحت چاہیں گے کہ نیکی کی قدر شرر کی تاریخی کہانیوں میں کیسے ظاہر ہوتی ہے؟ شرر کی کہانیوں میں 'مسلمان غازی' کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے چلن اور خیالات کی سمت نمائی اسلامی قدروں پر قائم ہے۔ اس کا عمل اپنے محدود دائرے میں جتنے بھی ایثار کرتا ہے وہ برائی کی طاقتوں کی نفی کرکے انسان کو انسان کے قریب لانے کی خواہش کے آئینہ ہوتے ہیں۔ وہ دکھ سے کہیں زیادہ سکھ اور اطمینان کی خوشخبری دیتا ہے زیردستوں کی حمایت میں اپنا خون بہانے سے گریز نہیں کرتا۔ بوڑھوں اور عورتوں پر ظلم نہیں کرتا اور انسان کو اس کی فراست کے مطابق اپنے خالق کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ ان سب باتوں سے اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں کہ شرر کا مرکزی کردار زمین پر بسنے والے انسانوں کو امن اور سلامتی کا ماحول واپس لوٹانے کی ذمہ داری پر مامور ہے اور اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ زمین پر نیکی کا قیام 'خیر مطلق' کی بشارت کا باعث ہے۔

خوشی، خوبصورتی، اطمینان، محبت اور عالمگیر انسانی اخوت — یہ سب ثانوی قدریں نیکی کی بنیادی انسانی قدر سے رونما ہوتی ہیں۔ میں نے جن دو بنیادی قدروں کا ذکر کیا ہے ان کی مدد سے انسان رقبۂ زمین پر اس قابل ہو جاتا ہے کہ کہ اب وہ اس حیرت انگیز تماشے کو جسے زندگی کہتے ہیں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرے یہ کوشش داخلی ارادت سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ایک ایسی سرحد پر ظاہر ہوتی ہے جہاں ہماری دنیا کسی طلسمی دنیا میں گم ہو جاتی ہے اور انسان طلسم اور حقیقت کے سنگم پر کبھی حقیقت کو طلسم کے حوالے میں بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی طلسم کو حقیقت کے بتائے ہوئے سانچوں میں ڈھالنے لگتا ہے یہاں فانی اور غیر فانی کی سرحدیں پھیلنے، سکڑنے اور پھر پھیلنے لگتی ہیں انسان اسے سمجھنے کے بغیر کہ یہ سب کچھ کیا ہے زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ انسان کی عظمت اس کی آزادی میں ہے اور وہ مغلوب ہو کر بھی نہیں رہ سکتا۔ خواہ اسے مغلوب کرنے کی قوتیں طلسمی ہوں یا سیاسی۔ وہ اپنے احساس میں وجود کو زائل کرنا نہیں چاہتا۔ اور روشنی کی تلاش کرتا ہے۔

بنیادی انسانی اقدار کی فہرست میں آخری قدر کا نام روشنی ہے! روشنی کی بنیادی انسانی قدر انسان پر کون سے راز کھولتی ہے میں اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتا تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ روشنی کے ذریعے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا اعلان ہوتا ہے۔ روشنی ہی کے ذریعہ فلاطونیت اور نو فلاطونیت پیدا ہوتی ہیں اس بنیادی انسانی قدر کی رہنمائی میں تہذیبوں کی تاریخ بنتی اور بگڑتی ہے انسان راستہ بھول کر دوبارہ راستے پر آتے ہیں اور اسی بنیادی انسانی قدر کی رہبری میں انسان "اے خدا! مجھے اپنا چہرہ دکھا" کا ذکر کرتا ہے یہ بنیادی انسانی قدر اندھیرے کو اجالے سے الگ کرتی ہے اور جہالت کو علم کی صورت دکھاتی ہے۔ انسان آنی جانی چیز ہے۔ لیکن صرف اسی قدر کے باعث وہ اپنے مختصر قیام میں ایک مستقبل کی بنیاد رکھ دیتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ پہلی دونوں بنیادی قدریں انسان کے زمانۂ حال سے تعلق رکھتی ہیں لیکن یہ بنیادی قدر اس کے مستقبل سے متعلق ہے۔ روشنی کی بنیادی انسانی قدر کے بغیر انسان کا مستقبل ظاہر نہیں ہو سکتا۔

(باقی آئندہ)

عبدالرزاق
ایف۔اے سال دوم

شاعرِ مشرق علامہ اقبال

کسی ملک اور قوم کی ترقی کے لئے جن نامور ہستیوں کو خدمت کرنے کی سعادت ملتی ہے ان میں شاعر کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں شعراء ہی قوم کے وہ افراد ہیں جو انسانوں کے خون کو گرما سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات ضروری ہے کہ شاعر کے کلام کو وہ کمال حاصل ہو جو قوم کے دل میں زبردست حرکت پیدا کردے کوئی غالب کو اچھا کہتا ہے کوئی میر تقی میر کے نغموں کا شیدا ہوتا ہے کوئی تنہائی میں افسردہ رہ کر زندگی گزارنے کو پسند کرتا ہے تو کوئی زندگی کے لگاؤ برقرار رکھنے کو عزیز جانتا ہے۔ پسند اپنی اپنی کے مطابق میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کو پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ انہوں نے کسی خاص مقصد کے لئے شاعری نہیں کی۔ بلکہ اقبال کے ہاں ہمیں ہر طرح کی شاعری ملتی ہے اور ان کے ہاں ایسی باتوں کی تفصیل موجود ہے جو ہمیں زندگی کے صحیح مفہوم سے روشناس کراتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں جو بنیادی اور اہم باتیں بیان کی گئی ہیں وہ فلسفۂ خودی اور حب الوطنی سے تعلق رکھتی ہیں

خودی سے مراد کوئی غرور اور تکبر نہیں ہے بلکہ اقبال کے ہاں خودی سے مراد وہ جذبہ ہے جو ہر ایک کے اندر کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا ہے اور ان کو بروئے کار لا کر کامیابی حاصل کرنے کی خواہش پیدا کرتا ہے یہ وہ خودی ہے جس کا تذکرہ ہمیں اقبال کے کلام میں ملتا ہے کبھی عرب کے ریگ زاروں میں مسلمانوں کی فتح اور کبھی اندلس کے میدان میں عظیم الشان فتوحات کا ذکر کرکے شاعرِ مشرق فرماتے ہیں:۔

کبھی دریا سے مثلِ موج اُبھر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر
کبھی دریا کے سینے میں اُتر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

پھر فرماتے ہیں کہ تو مشکلات سے نہ گھبرا۔ بلکہ آگے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر۔ اور تیرے لئے اس عالم میں بہت وسعت ہے۔ جس جگہ چاہے چلا جا۔

ظلامِ بحر میں کھو کر سنبھل جا
تڑپ جا پیچ کھا کھا کر بدل جا
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج
اچھل کر جس طرف چاہے نکل جا

ان کے ہاں خودی کو بہت اہمیت حاصل ہے اور زیادہ مناسب ہوگا اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اقبال کے ہاں خودی زندگی کا دوسرا نام ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب سے مسلمانوں میں خصوصاً اور دوسرے ہندوستانیوں میں عموماً آزادی کے لئے جو تڑپ پیدا ہوئی۔ اس کو برقرار رکھنے کے لئے سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے عظیم خدمات سرانجام دیں۔ لیکن جب وطن کی آزادی حاصل کرنے کا سوال اُٹھا۔ سیاسی بیداری

کا شعور پیدا ہُوا۔ اور قوم کے مُردہ جسم میں پھر زندگی کی رُوح نظر آنے لگی۔ اس وقت اقبال نے قوم کو سنبھالنے کی اور خاص طور پر مسلمانوں کو ایک ہاتھ پر جمع ہونے کی تلقین کی۔ اس کا پیش منظر یہ ہے کہ اسلام کسی ایک قوم کسی ایک ملک اور کسی ایک براعظم کے لئے پیغام امن بن کر نہیں آیا۔ بلکہ تمام دُنیا کے لئے صلح و آشتی کا پیغام بن کر آیا ہے۔ ایسے وقت میں اقبال نے یہ محسوس کیا کہ دنیا ذات پات نسل اور قومیت کے جھمیلوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ دُنیا کو دوبارہ اخوت اور محبت کا درس دیں۔ اور نہ صرف اپنے لئے آزادی حاصل کریں بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک ہاتھ پر جمع کرلیں۔ ملاحظہ ہو۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اور یہ بھی تلقین کی۔

یہ مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اس کے بعد جو چیز ہمیں اقبال کی شاعری میں ملتی ہے وہ یقین محکم ہے۔ جب ایک قوم کے افراد کے اندر یقین پیدا ہوجاتا ہے تو وہ زندگی کے ہر میدان میں ترقی کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ جو کام بھی وہ کریں گے انہیں یقین ہوگا کہ ہماری محنت ضائع نہیں جائے گی۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جسے اقبال اس شمع سے تشبیہ دیتے ہیں جو بیابانوں میں راستہ بھٹکے ہوئے مسافروں کی راہ نمائی کرتی ہے ؎

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

یقین سے زندگی کو ترقی ہوتی ہے اور اس کو مستحکم بنانے کے لئے صرف ایک چیز ہے اور وہ ایمان ہے۔ جب تک آدمی کا ایمان مستحکم ہے وہ فولاد کی طرح مضبوط ہے اور کوئی چیز اس کے آگے ٹھہر نہیں سکتی۔ پھر ایمان اور یقین کا ہی نتیجہ ہے کہ توحید کا جذبہ جنم لیتا ہے اور وہ جذبہ تین سو تیرہ مسلمانوں کو ہزاروں کے مقابلہ پر تیار کر دیتا ہے اندلس کے ساحل سمندر پر مسلمانوں کو کشتیاں جلانے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی قادر و توانا ہے۔ اور اس کا دامن پکڑنے کے بعد اور کسی سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی

اسی طرح اقبال نے زندگی کا جو درس دیا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی موت کے ساتھ بالکل ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ موت آتی ہی اس لئے ہے کہ زندگی سے ہمارا لگاؤ برقرار رہے۔

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

علامہ اقبال نے جہاں موت کو زندگی کے لئے لازم کر دیا ہے وہاں غم کو بھی زندگی کے ساتھ وابستہ کیا ہے ان کے ہاں غم اس لئے انسان میں ودیعت کیا گیا ہے کہ خوشی سے ہمارا لگاؤ برقرار رہے۔ اگر ہم بیمار نہیں ہوتے تو ہمیں صحت کا احساس بالکل نہیں ہوسکتا اور ہم اس کی قدر سے غافل ہیں۔ انہوں نے غم کو ایک ایسے پہلو سے روشناس کرایا ہے۔ گویا خوشی اور غم لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال
طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

المختصر اقبال کا پیغام یہ ہے ؎

فطرت کو خرد کے رُو برُو کر
تسخیرِ مقامِ رنگ و بُو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر

بقیہ محبت کے آنسو!

"اے میرے رازدار! میری قوم کے مایۂ فخر و ناز! تو میری جوانی کا سنگھار تھا۔ اور میرے دل کا سرمایۂ قرار۔ دنیا و آخرت کی سرخروئی حاصل کرنے والے تجھ پر آفرین۔ تو ایسا شفاف دل رکھتا تھا جو صرف عفو سے مانوس تھا اور درگذر میں راحت محسوس کرتا تھا۔ بڑا شگفتہ مزاج تھا تو! اور تیری فروتنی بھی تو قابلِ رشک تھی۔ تیرا دماغ، عقل و دانش سے مالا مال تھا۔ تو نے وطن کی خاطر ایک عظیم قربانی دی ہے

"اے میرے شیر! خدا کے سپرد ——— یقیناً جزا دینے والوں میں سے وہ بہترین جزا دینے والا ہے۔"

وہ قبر سے اُٹھی اور اس پر جھکی۔ اس کی خوبصورت گول آنکھوں سے چند قطرے گرے جو جرنیل کی قبر میں پیوست ہو گئے۔

یہ سفید موتی کیا تھے؟ کیا یہ محبت کے چند آنسو تو نہ تھے؟

قومی روح

نعیم قدسی

کائنات کا ہر ذرّہ ایک دوسرے سے وابستہ ہے عناصر کا باہمی ملاپ ہی اشیاء کے ارتقاء اور بقا کے فطری عمل کا دوسرا نام ہے۔ حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں پر اس عمل کا اثر اتنا شدید ہے کہ افراد کی فکری ذہنی اور عملی صلاحیتوں کے اتحاد کے بغیر کسی قوم کا تصور بھی ناممکن ہے زندہ قوموں کے افراد قومی تعمیر کے ہر امکانی پہلو کیلئے اپنی ہستی کو ایک مخصوص سانچے اور منظم طریق پر ڈھال لیتے ہیں۔ ان کا انفرادی اور اجتماعی عمل غیر شعوری طور پر قوم کیلئے وقف ہو کر رہ جاتا ہے۔ درحقیقت افراد کی یہی وحدت کسی قوم کی سالمیت اور استحکام کا موجب ہوتی ہے۔ انتشار خواہ کیسا ہی ہو انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں مضر ہے مسلسل اور اجتماعی جدوجہد اور تگ و دو کامیاب قومی زندگی کی اہم ترین خصوصیت ہے قومی ترقی کا راز افراد کی فکری ذہنی اور جذباتی وابستگی میں مضمر ہے یہی وابستگی افراد میں یکجہتی اور اجتماعی عمل کے جذبات کو اکساتی ہے قربانی اور ایثار کی بنیادوں پر قوم کے ساتھ ان کا تعلق مضبوط کرتی چلی جاتی ہے۔

ذاتی اغراض و مقاصد کے پیش نظر قومی تقاضوں کو نظر انداز کر دینا انفرادیت پسندی کے جنون میں قومی احساس اور انداز فکر کو کچل دینا اور خود پرستی کے زعم میں قومی مقصد کو قتل کر دینا در اصل قومی نسل کشی کے مترادف ہے وہ قومیں جن کے افراد کا طرز عمل اور انداز فکر خود غرضانہ ہو وہ بین الاقوامی سطح پر اپنی بازی ہار جاتی ہیں وہ قومیں جن کے افراد انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو گئے جن میں اجتماعی مقصد کے برعکس انفرادی عزت اور اقتدار کیلئے رسہ کشی ہوتی محکوم اور غلام بنالی گئیں اور ——— تاریخ نے اپنا یہ بدترین عمل بار بار دہرایا ہے یہ وہ یکجہتی، یگانگت اور اتحاد۔ فکر و عمل میں توازن اور ملاپ ——— قومی سطح پر سوچنے کا یہی انداز سب سے پاکیزہ اور اعلیٰ ہے یہی وہ جذبہ اور روح ہے جو قوم کی رفعت اور بلندی کی بنیاد ہے اور جو قوم بھی اس روح سے سرشار ہو کر اٹھتی ہے تاریخ میں اس کا ذکر سنہری الفاظ میں کیا گیا ہے۔

حضرت اکمل

محبت

ذیل کا مضمون آج سے نصف صدی قبل لکھا گیا۔ حضرت قاضی اکمل صاحب نے محبّت پر ایسی اعلیٰ انشاء پردازی کی ہے جو قارئین کے دلوں میں نہ صرف محبّت کی محبّت بلکہ خود حضرت قاضی صاحب کی محبّت بھی پیدا کر دے تو کیا عجب ہے۔ (ادارہ)

محبت! پیاری محبت! تیری دُنیا جُدا۔ تیرا جہان الگ تیرا عالم نرالا جس اہلِ دل کو دیکھتا ہوں، تیرا ہی متوالا ہے تو اس سرزمین کا گیاہِ خودرو ہے ——————

—————— تو وہ گوہرِ گراں مایہ ہے کہ جس کی شان میں آیا ہے "یہ وہ گوہر ہے جو ملتا نہیں شاہی خزینوں میں"۔

تیرے کانٹوں میں پھولوں کی مہک، تیرے جھاڑوں میں سبزوں کی لہک، تیری تاریکی میں نوروں کی ضیا۔ تیری باریکی میں شانِ کبریا۔ تیرے میدانوں میں جنت کا سماں۔ تیری زمین رشکِ صد آسماں۔ تیری پستی میں بلندی کا نشان اور تیری کمزوری میں قوت کی شان۔ تیری خوابوں میں بیداری اور تیری غفلت میں سو ہوشیاری، تیری قضا میں بقا کا عالم اور تیری جفائیں وفا کا کالم۔ تیری جہالت پر دانشوری قربان اور تیری ظلمتِ کفر میں نورِ ایمان۔ اور تیرے جہل میں طورِ عرفاں۔ اور تیری موت میں حیاتِ جاوداں۔ اور تیری زندگی میں مرگِ ناگہاں۔ تیرے ہجر میں وصل کا مزا اور تیرے گریہ میں ہنسی کی ادا۔ تیری ابجد خوانی عالم منتہی بنانے والی۔ اور تیری بے خبری صد آگہی دلانے والی۔ تیری پیری میں شباب کی ترنگ، تیرے بچپن میں بڑھاپے کا رنگ۔ تیری خاموشی میں سو فریادیں، اور تیری فریادوں میں چپ کی دادیں۔ تیرا ذرّہ ذرّہ مہر ساماں۔ اور تیرا قطرہ قطرہ بحر داماں۔ تیری شمعیں پروانوں پر نثار، اور تیرے پھول بلبلوں کے لئے دلفگار۔ تیرے بیابانوں میں باغوں کی بہار اور تیرے ریگستانوں میں سو آبشار۔

اے محبت! پیاری محبت تو میرے دل کی مصفّا شیشی میں عطر بن کر آ جا۔ تو میری شاخِ تمنّا پر پھول بن کر مہک۔ اور بلبل بن کر چہک۔ تو اس زمین میں تخم بن کر جا اور طوبےٰ بن کے نکل آ۔ تو میرے رونگٹے رونگٹے میں ایمان بن کر سما جا۔ اور اعمالِ صالحہ ہو کر عضو عضو سے ظاہر ہو۔

اے محبت میں تیری نسبت کیا کہوں جبکہ وہ سراپا محبت جو محب ہو کر آخر محبوب ہوا۔ کہتا ہے کہ

اے محبت عجب آثار نمایاں کردی
زخم و مرہم برہِ یار تو آساں کردی
ہمہ مجموعِ دو عالم تو پریشاں کردی
ہمہ عشاق تو سرگشتہ و حیراں کردی

اور پھر کیا خوب فرمایا۔

ہمہ جا شور تو بینم چہ حقیقت چہ مجاز
سینۂ مشرک و مسلم ہمہ بریاں کردی

اے محبت! اے ناتوانوں کی توانائی۔ اور شکستہ دلوں کی مومیائی۔ تو میرے سینے میں بھر جا۔ کہیں تجھ سے معمور ہو کر اکیلا وہ وہ کام کروں، جن کے لئے ساری دنیا کی اکٹھی قوت کی ضرورت ہوتی ہے، تو میری آنکھوں میں نور بن کر آ۔ تا اس ظلمت کدۂ عالم میں تیری روشنی کے ساتھ بے خوف و خطر سیر کر سکوں۔ میں جانتا ہوں کہ تو وہ شراب ہے جس کا خمار اعضاء شکن ہے۔ تو وہ گلِ نوبہار ہے جس کے ساتھ کئی کانٹوں کی انجمن ہے مگر میرے محبوب نے سچ کہا ہے ؎

واہ رے باغِ محبت موت جس کی رہ گذار
وصلِ یار اس کا ثمر پر اور گرد اسکے ہیں خار

لوگ کہتے ہیں کہ محبت قید بے زنجیر ہے۔ مگر یہ قید کیا ہی دلپذیر ہے جس پر سو آزادیاں نثار۔ اور یہ بربادی کیا ہی وجد انگیز، لطف خیز ہے جس پر ہزار آبادیاں قربان۔ وہ محبت کا روحِ رواں۔ وہ محبت کے آسمان کا مہرِ درخشاں فرماتا ہے اور سچ فرماتا ہے ؎

اس جہاں میں خواہشِ آزادگی بے سُود ہے
اک تری قیدِ محبت ہے جو کر دے رستگار
دل جو خالی ہو گدازِ عشق سے وہ دل ہے کیا
دل وہ ہے جس کو نہیں بے دلبرِ یکتا قرار

اے محبت! تمام شریعت کے احکام کو بجا لانیوالی۔ تمام منازلِ سلوک طے کروانے والی۔ ایمان کو میوۂ نورس بنانے والی۔ ایک تو ہی تو ہے۔ چنانچہ ایک تجربہ کار نے کہا ہے اور حق کہا ہے ؎

فقر کی منزل کا ہے اول قدم نفئ وجود
پس کرو اس نفس کو زیر و زبر از بہرِ یار
تلخ ہوتا ہے ثمر جب تک کہ ہو وہ ناتمام
اس طرح ایماں بھی ہے جب تک نہ ہو کامل پیار
تیرے منہ کی بھوک نے دل کو کیا زیر و زبر
اے میرے فردوسِ اعلیٰ اب گرا مجھ پر ثمار
باغ میں تیری محبت کے عجب دیکھے ہیں پھل
ملتے ہیں مشکل سے ایسے سیب اور ایسے انار
تیرے بن اے میری جاں یہ زندگی کیا خاک ہے
ایسے جینے سے تو بہتر مر کے ہو جانا غبار

اے محبت وہ تو ہی ہے جو آدھی رات کو تہجد کے لئے اٹھائے وہ تو ہی ہے جو سارا مال خدا کی راہ میں دلوائے! ہاں وہ تو ہی ہے جو گھر بار چھڑائے اور وطن سے بے وطن کرائے۔ بڑے بڑے امیروں کو فقیر بنائے، سارا سارا دن بھوکا پیاسا رکھوائے۔ ہاں وہ تو ہی ہے جس نے حسینؓ۔ مظلوم حسینؓ کو دشتِ کربلا میں کنبے سمیت پیاسے شہید کرایا۔ وہ تو ہی ہے جس نے ابوالانبیاء سے اپنے پیارے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے لٹوایا۔ تو نے ہی آگ میں خوشی خوشی ڈلوایا۔ اور تو نے کسی کو بکریوں کا شبان بنایا۔ اور کسی سے خنزیروں کو چروایا۔ اور کسی کا سر آرے سے چروایا۔ سچ ہے ؎

کون چھوڑے خوابِ شیریں کون چھوڑے اکل و شرب
کون لے خارِ مغیلاں چھوڑ کر پھولوں کے ہار
عشق ہے جس سے ہوں طے یہ سارے جنگل پُرخطر
عشق ہے جو سر جھکا دے زیرِ تیغِ آبدار

اے محبت تو نہ ہو تو نماز ایک محنت، روزہ ایک مصیبت، زکوٰۃ ایک ٹیکس اور حج ایک وقت فوردی ہے ؎

کون ہے جس کے عمل ہوں پاک بے انوارِ عشق
کون کرتا ہے وفا بن اس کے جس کا دل فگار

اے محبت تو ہو تو سب کچھ ہے۔ اگر تو نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ مگر اے محبت! تو ہو تو پھر اسی کے لئے جس کو مخاطب کر کے کہنے والا کہہ گیا ہے ؎

سو بڑھے سورج نہیں بے روئے دلبر روشنی
یہ جہاں بے وصلِ دلبر ہے شبِ تاریک و تار
اے مرے پیارے جہاں میں تو ہی ہے اک بے نظیر
جو ترے مجنوں حقیقت میں وہی ہیں ہوشیار
اس جہاں کو چھوڑنا ہے تیرے دیوانوں کا کام
نقد پا لیتے ہیں وہ اور دوسرے امیدوار

وہ رات کیا ہی مبارک تھی۔ جب دو بجے کے قریب میں اپنے نفس کا مطالعہ کر رہا تھا جب یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ اپنے محبوبِ لم یزل کے حضور تجھے ابھی حاضر ہونا پڑے تو کیا چیز ہے جو تو پیش کر سکتا ہے۔ آہ اس وقت کی ندامت کا پسینہ ابھی تک بہہ رہا ہے اور اس وقت تک میری روح کا ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ کوئی عمل نہیں۔ کوئی خوبی نہیں۔ اگر کچھ ہے تو یہ محبت۔ اس روح فرسا جان گداز گھڑی میں اگر کوئی چیز میرے لئے موجبِ تسلی تھی تو یہی کہ الحمد للہ۔ میرا دل بھی محبت سے خالی نہیں۔ پھر اس غم میں اگر سہارا دینے والے تھے تو یہ اشعار جو اس قابل ہیں، کہ جھوم جھوم کر پڑھے جائیں۔ اور دل ہی دل میں مزا اٹھائیں

؎ دوستی بھی ہے عجب جس سے ہوں آخر دوستی
آملی اُلفت سے اُلفت ہو کے دو دل پر سوار
دیکھ لو میلِ محبت میں عجب تاثیر ہے
ایک دل کرتا ہے جھک کر دوسرے دل کو شکار
کوئی رہ نزدیک تر راہِ محبت سے نہیں
طے کریں اس راہ سے سالک ہزاروں دشت خار
اس کے پانے کا یہی اے دوستو اک راز ہے
کیمیا ہے جس سے ہاتھ آجائیگا زر بے شمار
تیرِ تاثیرِ محبت کا خطا جاتا نہیں
تیر انداز و نہ ہونا سست اس میں زینہار
ہے یہی اک آگ تا تم کو بچا دے آگ سے
ہے یہی پانی کہ نکلیں جس سے صدہا آبشار
اس سے خود آکر ملیگا تم سے وہ یارِ ازل
اس سے تم عرفانِ حق سے پہنو گے پھولوں کے ہار

بقیہ ایم۔ آر۔ کیانی

کی فضا میں تصنیف و تالیف کا کام کر سکیں گے۔ انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ قائد اعظم کی ایک مستند سوانح حیات قلمبند کرینگے اگر انکی زندگی نے وفا کی ہوتی تو وہ بلاشبہ یہ کارنامہ سرانجام دیتے اس کے علاوہ طنز و ظرافت کے میدان میں ان سے انتہائی خوش آئند توقعات وابستہ تھیں وہ بلاشبہ اس میدان کے شہسوار تھے طنز و ظرافت کسی قوم کے ادب کا وقیع ترین سرمایہ ہوتی ہے اس سے افراد کا ذہنی جمود ٹوٹتا ہے اور قاری و سامع کے اندر خوش خیالی کی تحریک پیدا ہوتی ہے مرحوم نے اس میدان میں قوم کے لئے خاصی مقدار میں ذہنی غذا مہیا کی ہے اور انکا یہ ادبی تخلیقی ورثہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

سید منیر حسین شاہ
ایف۔ اے۔ سال دوم

جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی مرحوم

۱۶ر نومبر ۱۹۶۲ء کی صبح بڑی غمناک ثابت ہوئی۔ اس روز مغربی پاکستان کے سابق چیف جسٹس ایم۔ آر کیانی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

آپ اس روز چٹاگانگ میں تقریر کرنے والے تھے چٹاگانگ کے لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ وہ اپنے مخصوص شکل و صورت والے طنز و مزاح کے مجموعے کی باتوں سے لطف اندوز ہوں۔ مگر وہ ہاتھ جو آپ کے استقبال کے لئے اٹھنے والے تھے۔ آپ کو ہمیشہ ہمیش کے لئے الوداع کہنے کے لئے اُٹھے۔ آپ کی وفات صبح ۴ بجے ہوئی۔ آپ ایک جلسۂ عام میں ۹ بجے تقریر کرنے والے تھے۔ لیکن قسمت کو یہ منظور نہ تھا۔

آپ ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو شاہ پور کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ نے تعلیم کے مختلف مراحل ایڈورڈ کالج پشاور۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور ٹرینیٹی کالج کیمبرج میں طے کئے۔ آپ نے انگریزی میں ایم۔ اے کے علاوہ آنرز بھی کیا۔ کئی دوسری زبانوں میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اپریل ۱۹۴۹ء کو مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ۲۔ اپریل ۱۹۵۸ء کو چیف جسٹس کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے اور پھر ۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو عدلیہ کی گرانبار ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے۔

پہلا موقعہ تھا کہ زندگی میں سستانے کے آرزومند تھے۔ مگر موت نے انہیں فرصت نہ دی۔ اس اعتبار سے یہ موت ملک کے ایک انتہائی حساس اور دانشور فرد کی ذات کا المیہ بن گئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ پوری قوم کا بھی المیہ ہے۔ کیونکہ مرحوم کی ذات ملک کی عزیز ترین متاع تھی۔

گذشتہ چند سال کے دوران ان کی ذات اس ملک کی رائے پر منصب سے زیادہ اثر انداز ہوئی۔ وہ عدلیہ کی ایک باوقار شخصیت ہونے کے علاوہ رائے عامہ کے نازک ترین جذبات کے ترجمان بھی بن گئے تھے۔ اور اپنی خداداد ذہانت، فطانت اور ظرافت کے بل بوتے پر لسانِ پاکستان کی حیثیت حاصل کر گئے تھے۔

حق گوئی اور بے باکی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کے فکر و خیال سے قلب و نظر کو اجالا نصیب ہوا۔ اور جذبات و احساسات کو طراوت اور بالیدگی ملی۔ خدا انہیں اس خدمت کا اجر عطا فرمائے۔

بہرحال ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے بعد جب مرحوم ملازمت کی گرانبار ذمہ داریوں سے آزاد اور سبک سر ہوئے تو قوم نے بجا طور پر ان کی ذات سے یہ توقعات وابستہ کر لیں کہ اب وہ نسبتاً زیادہ فراغت اور ذہنی سکون

(باقی صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ ہو)

عابد ربانی
ایف اے (سال اول)

افسانہ

جو کبھی نہ مٹ سکے!

سردیوں کی ایک ٹھٹھری رات میں جبکہ چاروں طرف سناٹے کی حکمرانی تھی ـــ آکاش پر بادل چھائے ہوئے تھے ـــ ہلکی ہلکی بوندا باندی سردی کی شدت میں اضافہ کر رہی تھی درختوں پر بسیرا کرنے والے طیور اپنے برف کی مانند سرد گھونسلوں میں کبھی کبھی اپنے بارش سے گیلے پر پھڑپھڑاتے تو فضائے سکوت میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا مگر جلد ہی خاموشی کا خاموش سمندر پھر موجزن ہو جاتا ـــ

شہر سے باہر ایک سنسان تعمیر ظلمت کدہ معلوم ہو رہی تھی ـــ عمارت کے جنوبی حصے میں بڑے دروازے کے ساتھ چھوٹی سی کٹیا میں ایک مٹی کا دیا، سرسوں کے تیل کی مدد سے اس اندھیری رات میں یوں جل رہا تھا جیسے سیاہ زلفوں کے تلے کوئی ہیروں کا ہار اپنی روشنی بکھیر رہا ہو۔ اس دیپ کی زرد روشنی ـــ چاند کی شعاعوں کی مانند کٹیا کے اندر ضو فشانی کر رہی تھی ـــ

اس زرد زرد روشنی کا سہارا لئے کٹیا کے اندر ایک معمر شخص کچھ تحریر کر رہا تھا ـــ اس کے اردگرد کئی اشکال کے اوراق بکھرے پڑے تھے ـــ کاغذات کے دو تین بڑے بڑے پلندے اس کی بوڑھی اور تھکی ماندی کمر کو سہارا دیئے ہوئے تھے ـــ وہ کاغذ جس پر کہ وہ کسی پرندے کے پر سے کچھ لکھ رہا تھا ـــ اس کی آنکھوں سے فقط دو تین انچ ہی دور تھا ـــ اس کے بوڑھے اور جھریوں والے چہرہ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی ـــ تاہم وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مسلسل لکھے جا رہا تھا ـــ

یکایک بادل اس زور سے گرجا کہ تمام دھرتی ہل گئی بوڑھا بھی کانپ گیا ـــ اور اس کے کانپتے ہی اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی دوات زمین پر چھناک سے آگری ـــ

دوات گرتے ہی ٹوٹ کر شیشے کے کئی ٹکڑوں میں منقسم ہو گئی۔ دوات میں سے نکلی ہوئی سیاہی سے کٹیا کے سفید فرش پر بے ڈھنگے سے ایک دھبے نے جنم لیا ـــ یہ دھبہ دیکھتے ہی بوڑھا اور بھی زیادہ کانپنے لگا ـــ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ جلدی سے اس نے اوراقِ پارینہ کو سیاہی کی حدود سے دور کیا تا کہیں ان پر لکھی ہوئی تحریر پر وہ اپنا تسلط نہ جما لے۔

دوسرے ہی لمحے وہ سامنے پڑے ہوئے کاغذات کو اکٹھا کر رہا تھا ـــ اور ساتھ ہی ان کو ایک نظر پڑھتا بھی جاتا تھا ـــ لیکن شاید ان تمام اوراق میں کوئی بھی ضائع کرنے والا نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بوڑھا اپنا لمبا سا چوغہ پھاڑ رہا تھا ـــ وہ چیتھڑوں سے سیاہی کے نشان صاف کرنے لگا مگر اچانک ایک گرجدار آواز سے بوڑھے کے ہاتھ رک گئے۔

آواز پھر گونجی۔ "او بڈھے تجھے کتنی دفعہ کہا ہے کہ تو کٹیا کے اندر نہ لکھا کر۔ مگر تو باز نہیں آیا ـــ اور آج تو تو نے میرا

ستیاناس کر دیا ہے ۔۔۔ دیکھ تو نے میرے چاند سے شفاف فرش کو اس گرہن کیسا بدنما کر دیا ہے"۔۔۔ بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا ۔۔۔ "چل! اٹھ میرے گھر سے نکل جا" گرجدار آواز نے کہا ۔۔۔ "واللہ اگر تو میرا باپ نہ ہوتا تو جانے کب کا گھر سے نکل چکا ہوتا"۔ اس کے ساتھ ہی اس ناخلف پسر نے اپنے معصوم باپ کے بوڑھے جسم پر ایک ملعون ٹھوکر رسید کر دی ۔۔۔ بوڑھا گر پڑا ۔۔۔ لیکن جلد ہی وہ ایک کراہ کے ساتھ اُٹھا ۔۔۔ اور اپنے تمام کاغذات ایک چھوٹے سے تھیلے میں ڈال کر بیٹھ گیا ۔۔۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایک ناخلف بیٹا اپنے نیک، ادیب اور بوڑھے باپ کو بازو سے پکڑے اپنے گھر سے باہر نکال رہا تھا۔

بوڑھا اب بھی خاموش تھا ۔۔۔ وہ اپنا چھوٹا سا تھیلا بغل میں دبائے سردی سے ٹھٹھرتا ہوا جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ بوندا باندی جاری تھی اگرچہ بہت تھوڑی ۔۔۔ بوڑھے نے دو ایک مرتبہ اشکبار آنکھوں سے پیچھے کی جانب دیکھا ۔۔۔ مگر ابھی تک جبینِ پسریت معصوم اور بزرگ پدریت کی جانب غصے سے گھور رہی تھی۔ بوڑھے کے دانت شدتِ سردی سے بج رہے تھے۔ مگر پھر بھی وہ غیرت و حمیت کا پیکر بنے آہستہ آہستہ جنگل کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا ۔۔۔ بیٹا اپنی محل سرا میں واپس چلا گیا ۔۔۔ اور اطمینان سے اپنے بستر میں گم ہو گیا ۔۔۔

بوڑھا اپنی انجانی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ تھک جاتا یا سردی غالب آ جاتی تو کسی گھنے درخت کی شاخوں میں بیٹھ کر قدرے سستا لیتا ۔۔۔ وہ اب اپنے سابقہ مقامِ رہائش سے کافی دور آ چکا تھا ۔۔۔ اسی طرح وہ تمام رات ڈرتے، کانپتے اور ٹھٹھرتے ہوئے چلتا رہا ۔۔۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا ۔۔۔ اور بوڑھا تھک کر نڈھال ۔۔۔ اس نے اپنے تھیلے کو ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے پھینک دیا۔ وہ جنگلی درندوں سے بھی خائف تھا ۔۔۔ اور دوسری طرف اس کی سردی اور تھکاوٹ سے ہڈیاں دُکھ رہی تھیں اور جسم تھک کر چُور ہو چکا تھا ۔۔۔ شاید کسی محفوظ مقام پر پہنچ جاتا ۔۔۔ مگر اب تو اس میں ایک قدم اٹھانے کی سکت بھی نہ رہی تھی ۔۔۔ یکایک وہ کچھ بڑبڑایا اور پھر کمر کے بل گر پڑا۔ شاید وہ اس زمین، زر اور زن کی متوالی دنیا میں نہیں رہنا چاہتا تھا ۔۔۔ وہ اس دنیا سے مایوس ہو چکا تھا جو ایک بیٹے کو باپ کے مقام کا احساس نہیں دلا سکتی۔ اس کی بڑبڑاہٹ میں دنیا کے اس بہیمانہ سلوک پر واضح احتجاج تھا ۔۔۔ چند ساعتوں کے بعد وہ آخری سانس لے رہا تھا ۔۔۔ اور ساری عمر بہت کم مسکرانے کے بعد اب آخری وقت اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ عیاں تھی ۔۔۔ شاید وہ آخری بار اس لئے مسکرایا تھا کہ اس کے ادبی کاغذات ایک محفوظ جگہ پہ پہنچ چکے تھے ۔۔۔

عین اسی وقت شہر سے باہر ایک محل سرا آگ کا مسکن بنی ہوئی تھی ۔۔۔ لوگ گروہ در گروہ اس عمارت کی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے ۔۔۔ کیونکہ دنیا کی نظر میں یہ ایک بہت بڑے امیر کی محل سرا تھی ۔۔۔ لوگوں نے اسے آگ سے بچانے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ آخر چند گھنٹوں کے بعد یہ محل سرا کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی تھی ۔۔۔ ایک نعش جس کا گوشت و پوست جل چکا تھا ۔۔۔ بہت بھیانک منظر پیش کر رہی تھی۔ آگ

کیسے لگی؟ لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا ——— مگر انہیں کیا معلوم کہ فطرت سرکشی کو مہلت دیکر آخر کار اس کے پرخچے اڑا دیتی ہے۔ فطرت برائی کے ذرّے کو پہاڑوں کی صورت دھارتے نہیں دیکھ سکتی ——— اور برائی کے پہاڑ بننے سے پیشتر ہی اس کی چھوٹی چھوٹی چٹانوں کو پاش پاش کر دیتی ہے ———

کئی سال گذرنے کے بعد ایک دن ایک قافلہ کے لوگ جنگل میں پڑے ہوئے ایک، تھیلے کے کاغذات پڑھ رہے تھے ——— جوں جوں وہ کاغذات پڑھتے جاتے تھے ——— ان پر محویت طاری ہوتی جاتی تھی ——— یکایک چند آدمی "ادیب اعظم" "ادیب اعظم" کہتے ہوئے بوڑھے ادیب کی لاش کے پنجر کی طرف بڑھے اور اس کے گوشت دپوست سے بے نیاز ہاتھوں کو چوم رہے تھے ——— کیوں؟ اس لئے کہ ان ہاتھوں نے ان کو ادب کا وہ خزانہ دیا تھا جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بننے والا تھا۔

ایک سال کے بعد ہی جنگل میں منگل کا سماں بنا ہوا تھا ——— کیونکہ اسی بوڑھے ادیب کا ایک بے مثال مزار ہر انسان کو زبانِ حال سے پکار پکار کر صدا دے رہا تھا۔ "اٹھو ادب حاصل کرو ——— ادیب مٹ جاتے ہیں ——— لیکن ان کا لکھا ہوا کبھی نہیں مٹتا"۔ اس عظیم ادیب کی لوحِ مزار پر یہ الفاظ تحریر ہیں: "دنیا اور اس کے حوادث انسان کو مایوسی کے بندھن اور زنجیروں سے جکڑ دیتے ہیں ——— مگر عقلمند انسان وہی ہے جو ہاتھوں میں زنجیروں کے ہوتے ہوئے بھی اپنے قلم کو لکھنے سے نہیں روکتے ——— بلکہ حوادثِ زمانہ کا منہ اپنی تحریر سے بند کر دیتے ہیں"۔

بقیہ انمول موتی صـ۲۶

★ ——— رحم (قرابت) رحمٰن سے نکلا ہے جو قرابت کو قائم رکھتا ہے۔ خدا اسے ملاتا ہے جو اسے چھوڑ دیتا ہے خدا اس شخص کو چھوڑ دیتا ہے۔

★ ——— بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔

★ ——— اگر حبشی غلام بھی حاکم ہو جائے تو اس کی اطاعت تم پر فرض ہے۔

★ ——— لڑکیوں کی پرورش ایک امتحان ہے جو اس میں پورا اُترے گا وہ آتشِ دوزخ سے بچا رہے گا۔

★ ——— یتیم کی پرورش کرنے والا بہشت میں میرے ساتھ یوں رہے گا جیسے ہاتھ کی انگلیاں۔

★ ——— تم اہل دنیا پر مہربانی کرو خدا آسمان پر تم پر مہربان ہوگا

★ ——— سب کو ایک دیوار کی مانند ہونا چاہیئے جس کی ایک اینٹ دوسری کو مضبوط بناتی ہے۔

★ ——— لوگوں کو سلام کرنا۔ کھانا کھلانا۔ رات کو چھپکر نماز پڑھنا اسلام کی عمدہ تعلیم ہے۔

★ ——— عام سے محبت رکھنا نصف عقل ہے۔

★ ——— خندہ روئی سے ملنا۔ نیک کام بتا دینا۔ ضعیف البصر کو راہ پر ڈالنا۔ راستہ میں سے کانٹے پتھر ہڈی ہٹا دینا۔ کسی کو پانی کا ڈول نکال دینا۔ گھوڑے پر سوار کرا دینا۔ یہ سب کام بجائے صدقہ ہیں۔

★ ——— تحقیقات کا شوق نصف علم ہے۔

★ ——— جب تک علم کی طلب میں رہو گے خدا کی راہ میں رہو گے

★ ——— جہاں علم اور حلم جمع ہوں ان سے بہتر دو چیزیں کہیں ایک جگہ جمع نہ ملیں گی۔

افسانہ

"محبت کے آنسو"

انعام اللہ ہاشمی
بی۔اے (سال اوّل)

دریا اپنی سابقہ روایات کے مطابق پوری آب و تاب اور جوبن کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ دوسری طرف گھنا جنگل تھا۔ دریا ایک قوس کی شکل بنائے ہوئے اس مہیب اور تاریک جنگل کی تاریکیوں میں غائب ہو جاتا تھا۔ دو اطراف دریا گھیرے ہوئے تھا اور ایک طرف یہ گھنا جنگل۔ ..... جرنیل کی دوربین نظر نے اس مقام کو جنگی مصالح کے نقطہ نظر سے محفوظ دیکھتے ہوئے چن لیا اور وہاں اپنے خیمے نصب کر دیئے۔

سورج مغرب کی پہاڑیوں میں ڈوب چکا تھا۔ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر یوکلپٹس کے بلند و بالا درختوں کے پیچھے سے چاند دھیمے دھیمے طلوع ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نہایت پرکیف سماں پیدا کر رہے تھے۔ بھنورے اور تتلیاں پھولوں کی نرم و نازک پنکھڑیوں پر آرام کر رہے تھے دریا سے کچھ دور ایک اونچے سے ٹیلے پر ایک قلعہ تھا۔ رنگ برنگی شمعوں اور قمقموں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا موسم کی یہ دلربائی جرنیل پر وجد سی کیفیت طاری کر رہی تھی۔ وہ اسی حالت میں دیکھتا رہا۔ بادلوں کا ایک ٹکڑہ قلعہ پر سے گزر رہا تھا۔ کبھی اندھیرا ہو جاتا اور کبھی چاندنی جرنیل کو چاند کا یہ ناز و ادا بہت بھایا۔ قلعہ کے میناروں کی بلندی کچھ یوں معلوم ہوتا تھا گویا ستارے ان سے دل کا بھید کہہ رہے ہیں۔ گنبد ایسے ملائم اور چکنے کہ دستِ قدرت ان پر سے پھسل پھسل جاتا۔

رنگ برنگی کنکریوں سے آراستہ محل ـــ باغوں میں طرح طرح کے پھول ـــ اور شیشے کی طرح چمکتی دیواریں اپنا نمونہ آپ تھیں ـــ نوجوان جرنیل ان مناظر اور آثار کو عبرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کل ہونے والی جنگ میں فتح کے منصوبے سوچتا رہا۔

صبح کا سہانا موسم تھا۔ جرنیل قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رعنائیاں تھیں اور مسرتوں کے جانفزا پیغام۔ سورج کی کرنیں دریا کی لہروں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھیں نسیم سحری مسرت و جاودانی کے پھول برسا رہی تھی۔ ..... جرنیل اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

"آج کا دن فیصلہ کا دن ہے۔ یا تو اس سرزمین میں ناقوس بجیں گے یا پھر اللہ کا نام بلند ہوگا"

سرزمین اندلس کے جانباز شہسوار زرہ بکتر پہنے، چمکتی ہوئی ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے، گھوڑوں پر سوار بیش بہا اسلحہ اور ساز و سامان کے ساتھ لیس ہو کر قلعہ کے باہر اسلامی فوج کے بالمقابل صف آرا ہو چکے تھے۔ اگرچہ ان کا دل اسلامی فوج کے گذشتہ کارناموں اور

کامیابیوں کی وجہ سے مرعوب تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ ان کا مقابلہ ایسی قوم سے ہے جو اپنے مذہب کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مگر رات بھر ان کے خیموں میں عیش و نشاط کی محفلیں منعقد رہیں اور شراب کے دور چلتے رہے۔۔۔۔۔۔

مسلمان مجاہدین کے چہرے باوجود کمی اسلحہ کے دمک رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا زندہ رہے تو غازی کہلائیں گے اور اگر مر گئے تو شہید کا درجہ ان کے لئے محفوظ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ دشمنوں کی چمکتی تلواریں اور ایک لاکھ کا لشکرِ جرار ان کو مرعوب نہ کر سکا۔۔۔۔۔ مگر اس کے برعکس دشمن کا کوئی نصب العین نہیں تھا۔ وہ اپنی بے انتہا انواج کے باوجود بھی افسردہ خاطر نظر آ رہے تھے۔۔۔۔۔

تھوڑی ہی دیر بعد مسلمان جرنیل اسلامی لشکر سے باہر نکلا اور دشمن کو للکارتے ہوئے کہا۔

"کیا تم میں کوئی ہے جو مقابلہ کے لئے تیار ہو!"

ایک سردار دشمن کی فوج میں سے مقابلہ کے لئے آیا مگر مجاہد اسلام کے ایک ہی بھرپور وار کے ساتھ زمین پر آ رہا۔

بس پھر کیا تھا دونوں طرف سے لشکر ایک دوسرے پر پل پڑے۔ ہر طرف تلواروں اور نیزوں کی جھنکار تھی کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مجاہدینِ اسلام اپنی تلواروں کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ان کی تلواریں جہاں گرتیں صفایا کرتی ہوئی گزر جاتیں —— ان کا سردار سفید عربی گھوڑے پر سوار ان کے شانہ بہ شانہ جنگ میں لڑ رہا تھا اور فوج کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ اس کی تلوار جس طرف جاتی گاجر مولی کی طرح دشمن کو کاٹتی اور بجلی کی طرح کڑکتی اور کوندتی گزر جاتی۔ اس بہادر جرنیل نے کسی میدان میں بھی دشمن سے شکست نہیں کھائی تھی۔

آثارِ فتح نمایاں ہو چکے تھے۔۔۔۔۔ دشمن اِدھر اُدھر بکھر چکا تھا۔ اکثر دریا کی نظر ہو چکے تھے اور کچھ جنگل کی مہیب تاریکیوں میں گم ہو چکے تھے۔ جس طرف منہ اٹھا اسی طرف بھاگ اُٹھے ——

اسی اثناء میں ایک افواہ اُڑتی ہوئی آئی کہ مجاہدین اسلام کے کیمپ خطرہ میں ہیں۔ مسلمان اپنے کیمپوں کو بچانے کے لئے بھاگ اُٹھے۔ دراصل یہ دشمن کی چال تھی۔ ان کے سردار نے بہت سمجھایا کہ یہ وقت کیمپ سنبھالنے کا نہیں دشمن سے مقابلہ کرنے کا ہے اگر ہم جیت گئے۔ تو خزانے تمہارے قدموں میں ہوں گے۔۔۔۔۔ تم ساری مملکت کے مالک ہو گے مگر کسی نے اس کی طرف کان نہ دھرا بکھرا ہوا دشمن بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو دیکھ کر پلٹ پڑا۔ اور ایک ایسا بھرپور حملہ کیا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے دشمن کی چال کامیاب رہی۔ ہزاروں کھیت رہے اور ہزاروں دریا بُرد ہو گئے ان کا باہمت جرنیل لڑتا ہوا اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔

شام کی سیاہی ہر طرف پھیل چکی تھی میدان میں زخمیوں کی آہ و پکار کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی۔ کل جہاں گہما گہمی تھی جہاں شہنائیاں بجتی تھیں اب وہ سرزمین

سنسان پڑی تھی۔

رات کی سیاہی میں مسلمان پیچھے ہٹتے گئے۔ ان کا سردار اس مقام پر جہاں اس نے اونچے اونچے محلات اور مرغزاروں اور عظیم الشان محلات کا مشاہدہ کیا تھا۔ بیٹھا اپنی بے بسی پہ آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے کسی میدان میں شکست نہیں کھائی تھی۔ اس نے کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھا تھا۔ مگر آج کا دن اس کے لئے منحوس ثابت ہوا۔ اس کی تمام فوج یا تو مر کھپ گئی یا پیچھے ہٹ گئی تھی۔ وہ زخموں سے نڈھال تھکان سے چور، اپنے آخری وقت میں یاد الٰہی میں مصروف تھا۔

صبح دم جرنیل قید کی حالت میں بادشاہ کے دربار کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ شاہی محلات کی رنگینیاں اس کی توجہ اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ جگہ جگہ رنگ برنگ کے پھولوں کی کیاریاں عجب بہاریں دکھا رہی تھیں۔ محلات کے درمیان ایک مرمریں حوض تھا۔ جس کے کونوں میں مشعلیں آویزاں تھیں — جرنیل اس حوض کی روشوں پر سے گذرتا ہوا شاہی دربار میں پہنچا۔

بادشاہ ایک جڑاؤ تخت پر شان و شوکت کے ساتھ بیٹھا جرنیل کا انتظار کر رہا تھا۔ اور اس کے دونوں طرف ہسپانوی سپاہی ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔

بادشاہ!! اے جرنیل! بتا تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

جرنیل:۔" وہی سلوک جو ایک سردار دوسرے سردار سے کرتا ہے۔"

بادشاہ:۔ (نرم دل مگر بارعب آواز کے ساتھ) "بتاؤ تم نے ہماری سرزمین میں داخل ہونے کی کیوں جرأت کی؟"

جرنیل:۔" لوائے اسلام کو دنیا کے کونے کونے میں گاڑنے کی خاطر"!

بادشاہ:۔" لیکن تم جانتے ہو کہ ہم اسلام کے دشمن ہیں۔ پس تمہیں اس فعل کی قرار واقعی سزا ملنی چاہیئے۔"

جرنیل:۔" تسلیم!! لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کے آباؤ اجداد نے ہمارے مسلمان بھائیوں سے خون کی ہولی کھیلی تھی۔ کیا ہم اس جور و ستم کا بدلہ لینے کا حق نہیں رکھتے؟"

بادشاہ:۔" تو پھر دیکھ لیا اپنی حقداری کا نتیجہ!"

جرنیل:۔" اے بادشاہ! آج ہم اپنی جاہ حشمت کے غرور سے گرائے گئے ہیں لیکن تم جانتے ہو کہ اس سے قبل تم ہمارا نام سنکر کانپ جایا کرتے تھے۔ تمہارے سپاہی ہمارے مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے صلح کی درخواست کرتے تھے۔ گو مال و دولت کی فراوانی اور اپنے اعمال کی وجہ سے ہم کو یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم ہمیشہ کے لئے دب گئے۔ وہ وقت آتا ہے کہ جب نہ تو اس سرزمین میں دف بجے گا۔ اور نہ ناقوس۔ بلکہ ہر اطراف میں فقط اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام ہوگا۔ اور اس وقت تمہاری یہ جاہ و حشمت خاک میں ملا دی جائیگی۔"

بادشاہ:۔" اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم مجھے مرعوب کرنا چاہتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری دھمکیوں سے ڈر جاؤں گا؟ تم تو اب پل بھر کے مہمان ہو!"

جرنیل:۔" لیکن میں بھی تمہاری ان دھمکیوں سے مرعوب ہونے والا نہیں۔ دین کی خاطر جان کی یہ قربانی ہمارا عین مقصد ہے۔"

بادشاہ :۔ "تو پھر تم عنقریب اپنا انجام دیکھ لوگے"

جرنیل :۔ "لیکن تم بھی یاد رکھو کہ میرا خون ضرور رنگ لائیگا"

— بادشاہ کا حکم ہوا کہ جرنیل کو لے جایا جائے۔ اور کل سرِ عام پھانسی دے دی جائے —

جرنیل رات کو لیٹا ہوا کسی گہری یاد میں محو ہو گیا۔ اس کو اپنی موت کا فکر نہ تھا۔ اور نہ ہی اسے یہ خیال تھا کہ اس کی موت کے بعد ملک کو اس جیسا بہادر جرنیل میسر نہ آسکے گا۔ اسے یقین تھا کہ یہ علاقہ ضرور ممالک اسلام میں شامل ہوگا۔ ایک غم البتہ کبھی کبھی اس کے خیالات کو پریشان کر دیتا۔ وہ یہ کہ اسکی بوڑھی ماں اور نوجوان بیوی کا کون سہارا ہوگا اور پھر وہ انہیں خدا کے سپرد کر دیتا۔ اس طرح اپنی خیالات میں اس کی ساری رات کروٹیں بدلتے گذر گئی۔

آج جرنیل کو قتل ہوئے چار دن گزر چکے تھے۔ اور لاش کو سرزمین اسلام میں لا کر دفن کر دیا گیا تھا۔ . . . . .

رات ڈھل چکی تھی۔ چاند کی گہری روشنی میں ایک سفید سایہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک سفید بالوں والی بوڑھی عورت لکڑی کے سہارے چلی آرہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ جرنیل کی قبر پر جا پہنچی اور دیر تک مرحوم جرنیل سے باتیں کرتی رہی۔

"اے شہید قوم! تجھ پر آفرین — کہ تو نے خدا کی راہ میں جان دی ہے۔ وہ روح جس نے تیرے جسم سے پرواز کی اور وہ جسم جو تیری قبر میں سمایا ہوا ہے ابد تک اللہ کی حمایت و حفاظت کے سائے میں ہے۔ تیری زبان اور تیرا ہاتھ رب سے زیادہ پاک تھا اور تیرا دل اور نیک دامن رب سے وسیع۔ تو اپنا صلہ حاصل کرنے کے لئے اپنے خدا کے حضور حاضر ہو چکا۔ تیرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا اجر ہو سکتا ہے وہ دن جلد چڑھے جب یہ جگہ خدا اور اسکے رسول کے نام سے گونج رہی ہو۔

"اے شہید! اے میری جان کے سہارے تو مجھ سے رخصت ہو گیا لیکن تو حمید اوصاف کے ساتھ رخصت ہوا ہے تیرا دامن ہر قسم کی خواہشات سے پاک تھا۔ آنیوالی نسلیں تیرے نام پر فخر کریں گی۔ قوم کی خاطر یہ قربانی کیسی بادقار ہے۔

"اے میرے لختِ جگر! میری آنکھوں کے نور! تو نے بڑے احسن طریق سے اپنے فرائض کو انجام دیا۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا مجھے اس قابل فخر فرزند سے جلد ملا دے کیونکہ اس کی جدائی کے بعد میرے لئے صبر و تشفی کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے اس سے ملنے کی امید —"

اتنا کہہ پائی تھی کہ شفقت مادری کے آنسو آنکھوں سے بہنے لگے۔ اس نے قبر پہ ایک طویل نظر ڈالی۔ اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئی :۔

"الوداع! اے میرے بڑھاپے کے سہارے الوداع!! رخصت! اس وقت تک کے لئے رخصت جب تک کہ خدا آخرت میں مجھے اور تجھے ملا دے!!"

اب ایک اور حسین سایہ جرنیل کی قبر کی طرف ماتمی لباس پہنے ہوئے بڑھا۔ یہ جرنیل کی بیوہ تھی۔ وہ قبر کے قریب آئی۔ اور ایک آہ لی۔ اور جرنیل کی قبر پہ ڈھیر ہو گئی ہوش آیا تو یوں مخاطب ہوئی۔

(باقی دیکھو صفحہ ۳۶ کالم ۱ پر)

اَفسانہ

غیرت کا امتحان

رشید احمد جاوید

جنگل کی فضا بسیط پر سناٹا طاری ہے۔ ہُو کا عالم ہے، غیر محدود وسعتوں پر محیط ہے۔ جنگھاڑ بند ہے۔ پتوں کی سرسراہٹ ملتوی ہے۔ پرندے چہچہانے سے شرما رہے ہیں۔ حدِ سماع تک خاموشی کی سلطنت ہے اور سکوت کی بادشاہت۔ ہاں کبھی کبھی ندی کے اندر سے بھنور کے بننے اور ٹوٹنے کی خفیف سی آواز، صدائے انقلاب بلند کر جاتی ہے ـــــ آدھی رات کا وقت ہے ـــ چاند کا حسن و جمال اور چمک دمک کمال کو پہنچی ہوئی ہے ـــ چاندنی کی فراوانی میں تاروں کو اپنی قلتِ تعداد کا شدید احساس ہے۔ تاہم حال خال جو باقی رہ گئے ہیں ان میں نور کی رمق یہ امید بڑھاتی ہے۔ کہ مستقبل تاریک نہیں ـــ چاند حال کی شفقت سے محفوظ نظر آتا ہے اور تارے مستقبل کو حوصلہ افزا پاکر خوش ہیں ـــــ آئیے امید و بیم کی اس دنیا میں، ہم ہموم و غموم کا ایک جہان لبسائیں۔ ایک ایسا جہان کہ جس کے "آج اور کل" حزن و ملال اور رنج و غم کے اظہار سے کبھی نہیں تھکتے ـــــ

فخرؔی اپنے بنگلے سے باہر گول تالاب کے کنارے کھڑا ہے۔ دفعتہً اس کی نظر چاند پر جا پڑتی ہے ـــ "اے مغرب کی وادیوں کے دلدادہ چاند! تجھے اپنے حسن و جمال پر کس قدر ناز ہے اور اپنی خوبروئی پر کس قدر فخر!! تو خاتمِ حسینان کا خطاب کسی اور کیلئے گوارا نہیں کر سکتا۔ مگر تجھے یہ اعتراف کرنا پڑیگا کہ اپنے حسن و جمال کا تجھے وہ پاس نہیں ہے جس کا مظاہرہ آج شب میرے، ہاں میرے چاند نے کیا۔ تو اپنی زندگی کا ایک بھی واقعہ ایسا نہیں بتا سکتا کہ تیرے جمال پر آنچ آنے کا وقت آیا اور تو دفورِ غیرت سے بپھر پڑا۔ نہیں بلکہ تو نے ہمیشہ ایسے موقعہ پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ تیرا جمال گہنا گیا اور اس کا وقار جاتا رہا۔ لیکن آج شب جب میرے چاند کا جمال خطرہ میں پڑا۔ تو اس نے اس کی پوری پوری حفاظت کی۔ اس نے اپنے کردار کی خوبصورتی کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ کیا کہ دنیا کی کوئی طاقت اب اسے نہیں گہنا سکتی۔ دیکھ کیونکر میرے چاند کے روئیں روئیں سے معصوم اور بے داغ جمال کے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس واقعہ کو دیکھکر تیری "عادتِ تسلیم" میں بھی جوش آگیا ہوگا۔ اے کاش! اگر تجھے قانونِ قدرت کی بیڑیوں نے نہ جکڑا ہوتا تو تو میرے چاند کو خراجِ تحسین ادا کرنے کے لئے زمین پر میرے پاس پہنچتا۔ افسوس صد افسوس!! خیر یہ گواہی بھی تیرے لئے کم باعثِ افتخار نہیں کہ غیرت و حمیت کا جو واقعہ آج تیرے مشاہدہ میں آیا۔ وہ ایک نہایت ہی نادر واقعہ ہے۔

اے ستارو! تم چاند کی گواہی کی تائید کرو کہ تم بھی

اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہو" ——— فخری کے منہ سے یہ کلمات کچھ ایسے جوش اور درد سے نکل رہے ہیں کہ اس کی ہچکی بندھ گئی ہے —— گرم گرم آنسو اس کے رخساروں سے پھسلتے ہوئے ٹپ ٹپ زمین پر گر رہے ہیں —— اس کی نظریں تالاب کی گہرائیوں پر جم گئی ہیں ——— کچھ دیر سسکیاں بھرنے کے بعد وہ جوش درد سے پھر چونک اٹھا ہے "اے میری آذفی کے تالاب کی مچھلیو! تم بہت ہی خوش قسمت ہو کہ آج تم نے جس خون کو چکھا ہے اس کو میری آذفی نے پورے تیس سال غیرت کی بھٹی میں جوش دیا تھا۔ آج جب اس غیور خون کا نقطہ جوش اپنی انتہائی حد سے بڑھ گیا تو وہ بے اختیار کھول اٹھا۔ اگر کوئی طبیب زمین کی اس مٹی سے جس کو میری آذفی کے خون نے سیراب کیا، "ایک نسخۂ غیرت" تیار کرے۔ تو میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کم ہمتوں اور بزدلوں کے لئے "ایک زبردست اکسیر" ثابت ہوگا" ———

فخری کے رنج و الم میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فخری آج تنہائی کی ان گھڑیوں میں سوز و ساز اور رنج و غم کا کوئی اہم تہوار منا رہا ہے ——— اسے فخری کہیں یا کسی نہانی درد کا ترجمان مجسمہ ——— وہ بیک وقت فخری بھی ہے اور مجسمہ بھی ——— شاید اس کی آنکھوں کا کسی نہ ختم ہونے والے چشمہ سے تعلق ہو گیا ہے۔ آخر یہ "آب درد" کیوں ختم ہونے کو نہیں آتا؟ ———

فخری تالاب سے ہٹ کر اپنے بنگلے کے قریب ایک بڑے سے برگد کے درخت کے نیچے آ کھڑا ہے۔ اس کی نظریں اوپر اٹھتی ہیں اور پھر اسی انداز سے نیچے آ جاتی ہیں ——— وہ پرندوں سے کچھ استفسار کر رہا ہے ——— "اے پرندو! تم آج کیوں اتنے سہمے سہمے اور غمگین نظر آ رہے ہو؟ چاند کی اس عالمتاب روشنی میں تمہاری خاموشی کا کیا مطلب؟ اور برگد کے ان پتوں کو کیا ہوا؟ ان کی سرسراہٹ کہاں گئی؟ یہ کس کے سوگ میں چپ ہیں؟ ہوا کس کے احترام میں بند ہے؟ تم مجھے میرے ان سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ شاید تم میں سکت نہیں رہی! شاید ان سوالوں کے جواب تمہاری قوتِ برداشت سے باہر ہیں!!"

وہ خود ہی ان سوالوں کے جواب دیتے ہوئے آذفی کے خون سے لت پت جسم کے قریب جا کھڑا ہے۔ آذفی کے چہرہ پر کسی زبردست کامیابی کی مسکراہٹ کھیل رہی ہے ——— فخری آذفی سے مخاطب ہوتا ہے۔ اسے یہ معلوم ہے کہ اس کی نہایت ہی وفادار رفیقۂ حیات آذفی ہمیشہ ہمیش کے لئے اس سے رخصت ہو چکی ہے لیکن وہ اسے بار بار پکارے جا رہا ہے ——— بالکل دیوانہ وار ——— "آذفی میں تیرے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ سننا چاہتا ہوں۔ تو مجھے صرف ایک دفعہ ہی جواب دے دے۔ "ہاں میرے فخری! تو کیا چاہتا ہے" تو میں فوراً کہہ دوں "آذفی، وفادار آذفی" ——— فخری کے ناموس کی خاطر تمہاری یہ قربانی!! ——— اے کاش میں اس کے مناسب حال کوئی جزا ڈھونڈ سکوں لیکن کیا میں اس تلاش میں کامیاب ہو سکوں گا! ——— آذفی تیرے خلوص اور وفا کا احسان اس قدر بھاری ہے کہ اسے کسی صورت بھی اتارنا میرے لئے محال نظر آتا ہے خدا کی قسم اگر تمہاری دین دوستی اور خدا پرستی کا احساس نہ ہو تو ابھی تمہارے ساتھ اپنے آپ کو ابدی نیند سلا دوں

مگر میں جانتا ہوں میرے اس فعل سے تمہاری روح کو سخت تکلیف ہوگی ـــــ مجھے تیرے پیارے الفاظ خوب یاد ہیں "خودکشی بزدل ترین انسانوں کا کام ہے" مگر تیری بہادری کا واقعہ تو ابھی چند ساعتوں کا ہے۔ اگرچہ حق یہی ہے کہ جو درد اور تکلیف تیری جدائی میں محسوس کر رہا ہوں وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن میں تیری روح کو تکلیف دیکر اور خود کو بزدل بنا کر کیونکر تیری معیت حاصل کر سکتا ہوں۔ تیری روح کی تسکین کے لئے صبر کی کوشش کرتا ہوں لیکن حواس متعلقہ ساتھ نہیں دیتے ـــ مرضیٔ فطرت کے سامنے مجبور ہوں ـــ بے اختیار ـــ ایسے لمحات میں تیری رہنمائی کام آیا کرتی تھی مگر وہ آذفی کہاں سے ڈھونڈ لاؤں جو میرے ساتھ باتیں کرے" ـــــــــــــــ

ـــــ فخری اپنا نوحہ جاری رکھنا چاہتا ہے وہ زیادت کرب وغم سے کانپ رہا ہے ـــ الفاظ سسکیوں میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی "افسوس ـــ افسوس ـــ وفاکیش ـــ آذفی ـــ اور میرے شیر" کے الفاظ گلے سے نکلتے سنائی دیتے ہیں ـــــــــــ

ـــــ کچھ دیر سخت دگرگونی کی کیفیت کے بعد فخری کی حالت قدرے سنبھلتی ہے ـــ "اچھا! رحمٰن خدا کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ شاید کہ توفیقِ صبر عطا ہو جائے۔ اے موفق! میں تجھ سے توفیق کا طلب گار ہوں ـــ میرے دل پر تسکین نازل فرما۔ آمین یا ارحم الراحمین" ـــــــــــ

ـــــ فخری اپنے علاقہ کے ایک بہت بڑے زمیندار کا نورِ چشم تھا۔ باپ کی وفات کے بعد تمام جائداد کا وارث ٹھہرا۔ لیکن بہت آوارہ مزاج واقع ہوا تھا۔ جوا۔ قماربازی اور شراب نوشی ایسی خرافات نے اس کے کردار کو تباہ کر دیا تھا۔ ہمسایہ زمیندار نجیرؔ بھی کافی مالدار تھا۔ تمام زمین اس کے ساتھ جوا میں ہار دی۔ باپ کی وفات کے ایک سال بعد جب اس کی شادی ماموں کی لڑکی آذفی سے ہوئی تو پچیس مربعوں کے مالک کی پونجی کل پانچ ایکڑ تھی۔ باقی تمام زمین وہ جوا کی خاطر رہن کر چکا تھا۔ لاکھوں روپیوں کی جائداد دوستوں یاروں کے ساتھ مِل کر عیش و عشرت میں ضائع کر دی تھی۔ . . . .

. . . .

۲

آذفی کو تھوڑے ہی عرصہ میں معلوم ہو گیا۔ کہ فخری کی کمزوریاں تو بہت مہنگی پڑیں گی۔ اس نے حسن تدبر اور حکمتِ عملی سے ان کمزوریوں کا علاج کرنا شروع کیا ـــــ جب بھی اس نے اس معاملہ میں کوشش کی، اسے تھوڑی بہت کامیابی ضرور ہوئی تو آذفی کی ذاتی جذب و کشش اور بلند کرداری بھی فخری پر کافی اثر انداز تھی۔ وہ اس سے بہت ہی محبت کرتا تھا۔ ایک شام جبکہ میاں بیوی بیٹھے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ آذفی کے دل میں نہ جانے کیا گذری کہ اس نے فخری سے پوچھ ہی لیا۔

"فخرو! سچ سچ بتاؤ تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے"

"جتنی کہ ایک خاوند کو اپنی بیوی سے ہو سکتی ہے۔"

فخری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ آذفی کچھ شرما سی گئی۔ مگر اس نے پھر پوچھا۔

"لیکن "عشق" کو ناپنے کے لئے میرے پاس کوئی

"آہ نہیں۔ آخر معلوم تو ہو کہ اس جنتی "کی کمیت" کیا ہے۔"

"پیاری اَدْفی! کیا محبت کی بھی کمیت ہوا کرتی ہے۔ بہت بھولی ہو تم! مجھے تم سے اتنی محبت ہے کہ اُسے معلوم کرنے کے لئے کوئی پیمانہ ایجاد نہیں کیا گیا۔"

"کیا تم یہ سب کچھ تکلف سے تو نہیں کہہ رہے؟"

"نہیں اَدْفی! اگر تجھ سے بھی دل کی بات نہ کہی تو اور کس سے کہنی ہے؟"

"اچھا اگر ایسا ہی ہے تو مجھے اجازت دو کہ میں تمہاری محبت کو آزما سکوں۔"

"اَدْفی! تجھے حقِ آزمائش دیا جاتا ہے۔ انشاء اللہ مجھے ثابت قدم پائے گی۔"

"انشاء اللہ! انشاء اللہ! تو فخری سنو۔ پرچہ امتحان میں نے پہلے ہی سیٹ کر رکھا ہے۔ اب تم میرے سوالوں کے صحیح صحیح جواب دیتے جانا۔"

"بہت ہوشیار ہو تم اَدْفی! لیکن میں بھی تیاری امتحان کی مہلت طلب نہیں کرتا۔ صنفِ نازک نے ہمارا کیا امتحان لینا ہے۔"

"فخری تمہیں معلوم ہے کہ تم روزانہ شراب نوشی کرتے ہو؟"

"ہاں مجھے اس کا خوب علم ہے اس وقت بھی میری آنکھوں میں اس کا خمار موجود ہے، بخدا تیرے بعد یہ دنیا میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ ہم اس کے لئے کتنا روپیہ خرچ کر رہے ہیں؟"

"تقریباً ایک صد یومیہ۔"

"اور اس کے لوازمات پر؟"

"اتنا ہی مزید۔"

"اچھا تو فخری اگر تو میرے ساتھ اپنے دعوئ محبت پر قائم ہے تو اقرار کر کہ آئندہ کلی طور پر اس "اُمّ الخبائث" سے اجتناب کرے گا۔"

"اگرچہ تمہارے پرچہ امتحان کی پہلی شق نے ہی مجھے چکرا سا دیا ہے تاہم میں اپنے الفاظ کی خاطر تمہاری اس خواہش کو پورا کرنے کا عہد کرتا ہوں۔"

"فالحمد للہ الموفق! اب تو میرے پرچہ امتحان کی دوسری شق یہ ہے کہ کیا فخری کو معلوم ہے کہ جوا بازی اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے؟"

"درست ہے میں کل ہی فجرو کے ساتھ ایک ہزار اشرفیاں ہار کر آیا ہوں۔"

"تو سُن میرے پیارے فخری! اگر میرے ساتھ تیرا پیمانِ محبت ایک خالی دعویٰ نہیں تو پھر اس عادتِ ملعونہ کو خیرباد کہنا ہوگا۔ کوئی ہوشمند انسان گدائی کو بادشاہی پر ترجیح نہیں دے سکتا۔"

"تیری محبت کی قربانگاہ پہ میں اپنی ہر خواہش کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"اتنا بڑا عزم! اس قدر عظیم قربانی کا عہد! خدا تیری ہر خواہش کو پورا کرے۔ اَدْفی کی محبت انشاء اللہ تجھے کسی ناپسندیدہ کام کے لئے مجبور نہیں کرے گی۔ تمہارے اس آخری فقرہ میں میرے تمام پرچہ امتحان کا جواب آجاتا ہے۔ اب اس امتحان میں تمہاری کامیابی کی نشانی یہ ہوگی کہ آنے والے ایام میں تمہاری حالت تبدیل

سدھر تی جائے گی اور تو بہت جلد فجُو و سے بھی بڑا زمیندار بن جائے گا۔"

"اَذْفی! کیا ایسا ممکن ہے؟"

"ہاں فخری! بس تم اپنے عہدِ محبت پر قائم رہنا۔ یہ سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے "ممکن" ہو جائے گا۔"

۳

فخری نے اَذْفی کی رہنمائی میں زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس کی عظمتِ رفتہ واپس لوٹ آئی۔ جاہ و حشمت نے اس کے گھر میں پھر ڈیرے ڈال لئے کھوئی ہوئی دولت اپنے اصل گھر کی راہ پانے لگی۔ ہر سُو اس کی شرافت اور نجابت کا چرچا ہونے لگا۔ قسمت نے ساتھ دیا۔ صرف پانچ ماہ کا عرصہ شادی پہ گذرا تھا کہ اَذْفی نے تمام مرتہن اراضی فجّرو کے ہتھکنڈوں سے آزاد کرا لی۔ فخری نے جو اس انقلاب ماحول کو دیکھا تو ہمیشہ ہمیش کے لئے خدا کا ایک شکر گزار بندہ بن گیا۔ ایک دن اس نے اَذْفی کو کہا ــــ

"اَذْفی! میرا دل چاہتا ہے کہ ہم اس قریب کے جنگل میں ــــ آبادی کی شورشوں سے دور ــــ پُرسکون ماحول میں ایک بنگلہ بنائیں اور پھر کبھی کبھار شکرِ نعمت کے طور پر اس بنگلہ میں رہائش کر کے حقوق اللہ کی ادائیگی کا اہتمام کیا کریں۔"

اَذْفی کا دل یہ تجویز سُن کر باغ باغ ہو گیا۔ اس نے فخری کو مشورہ دیا کہ وہ صبح ہی کسی جگہ کا انتخاب کرائے تاکہ جلد از جلد بنگلہ تیار ہو جائے۔ فخری نے جنگل کے عین درمیان کھلی فضا میں "رحمت ندی" کے قریب ایک جگہ کا انتخاب کیا۔ چند ہی روز میں "جنگل میں منگل" کے پروگرام نے تکمیل پائی ایک خوبصورت بنگلہ بن کر تیار ہو گیا۔ آنگن میں ایک گول "تالاب" بنایا گیا۔ تالاب میں رنگا رنگ کی مچھلیاں چھوڑ دی گئیں ــــ کوئی سُرخ، کوئی سبز، کوئی نیلی اور کوئی پیلی ــــ سبزہ زار کے درمیان یہ چھوٹا سا بنگلہ جنت نظیر سماں پیدا کر دیتا۔ اَذْفی اور فخری یہاں اپنے خالق کی حمد کے گیت گایا کرتے۔ نفلی نمازوں کے لمبے لمبے پروگرام یہاں شرمندۂ تعبیر ہُوا کرتے ــــــــ

ــــ۔ شادی پہ چھٹا ماہ گذر رہا تھا۔ فروری کا آخری عشرہ بہار کی تمام رنگینیوں سے بھرپور قریب آ رہا تھا فخری اور اَذْفی یہ ایام اپنے بنگلہ میں گذارنا چاہتے تھے۔

۴

پڑوسی زمیندار فجّرو نے فخری کی بڑھتی ہوئی نیک شہرت کو بہت محسوس کیا۔ فخری کی تمام زمین واگذار ہو چکی تھی۔ فجرو کو اس بات سے بہت قلق تھا۔ اس کی خواہشات پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی تھیں۔ وہ تو فخری کو اپنا غلام بنانا چاہتا تھا۔ وہ دن رات حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ ہمہ وقت فخری کے خلاف منصوبے سوچنے میں مصروف رہتا۔ اور جب اسے یہ معلوم ہُوا کہ فخری کی زندگی میں انقلاب کی اصل محرک اور ذمہ دار اَذْفی ہے تو اس نے یہ سکیم بنائی کہ چند دنوں تک جب دونوں میاں بیوی آبادی سے دور بنگلہ میں قیام پذیر ہوں تو کیوں نہ اَذْفی کو اغوا کر لیا جائے۔ اور اگر ہو سکے تو اسے دولت کا لالچ دے کر فخری کے خلاف کر دیا جائے۔ نیز مجبور کیا جائے کہ وہ فخری سے طلاق حاصل کر کے میرے ساتھ شادی کر لے۔ اس غرض کے لئے اُس نے

اپنے مزارعین میں سے دو درجن بہادر نوجوان اکٹھے کئے۔ انہوں نے سکیم کی تائید کی اور وفاداری کا پورا پورا یقین دلایا ــــ

اُدھر فجری اور اَدَفی پروگرام کے مطابق بنگلہ پر جا چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے شکر و سپاس اور حمد و ثنا میں اوقات بہت خوشگوار گذر رہے تھے۔ آخری عشرہ کی تکمیل میں ابھی دو دن باقی تھے۔ فجرو نے بھی ایک رات اپنے جوانوں کو ساتھ لیکر جنگل کی راہ لی۔

بنگلہ کے قریب پہنچکر ان مددگاروں کو تو چھپا دیا۔ اور خود بنگلہ کا جائزہ لینے کے لئے قریب چلا آیا۔ ایک کوٹھڑی کے سوراخ سے روشنی کی کرنیں نظر پڑیں۔ وہ اس سوراخ کی طرف بڑھا۔ اندر جھانکا۔ فجری چارپائی پر سو رہا تھا۔ اَدَفی کو مشغولِ نماز پایا۔ اس کی بہادری کے واقعات اس نے پہلے ہی سُنے ہوئے تھے اسے یقین تھا کہ اگر اَدَفی کے جذبۂ شجاعت کو اکسایا گیا تو وہ ضرور تن تنہا بنگلہ سے باہر نکل آئے گی۔ اپنے آدمیوں میں سے ایک کو کہلا بھیجا کہ درخت پر چڑھ کر لکڑی کاٹنا شروع کرے۔ خود بنگلہ کی اوٹ میں ایک طرف ہو گیا۔

(۵)

جلد ہی کلہاڑی سے لکڑی کاٹنے کی آواز خاموش فضا میں گونجنے لگی ــــ "ہائے یہ کون کمبخت میری نعمتِ سکوت پر ڈاکہ زن ہے؟ میرے پُرسکون ماحول میں خلل اندازی کی کسے جرأت ہوئی؟ شاید اس لکڑہارے کو یہ علم نہیں کہ نصف شب کے یہ قیمتی لمحات لکڑی کاٹنے کے لئے نہیں بلکہ خالق کی یاد میں محو ہونے کے لئے ہیں۔ میں ابھی جا کر اُسے روکتی ہوں۔"

اَدَفی اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی کمرہ سے باہر نکلی اور آواز کی جانب چل دی۔ چند قدم ہی گئی تھی کہ ایک آواز سنی ــــ "اَدَفی! ٹھہرو۔ مجھے تم سے ایک کام ہے۔"

"کون ہو تم! اور اتنی رات گئے تمہیں میری کیا ضرورت پڑی؟" بہادر اَدَفی گرجتے ہوئے بولی۔ قریب تھا کہ فجرو اس کی آواز کے رعب میں آ جاتا لیکن جلد ہی سنبھل کر بولا "تم مجھے جانتی نہیں؟ میں فجرو ہوں۔ اس علاقہ کا رئیس اعظم!! میں تجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ جلدی بتاؤ۔ تمہارا اس معاملہ میں کیا فیصلہ ہے؟"

"ہاں میں کنوئیں کے مینڈک فجرو کو خوب جانتی ہوں۔ کیا وہ آج رات میری غیرت کو چیلنج کرنے آیا ہے؟ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اَدَفی اس جیسے کئی فجروؤں پر بھی بھاری ہے۔"

"تو کیا تو میری بات نہیں مانے گی؟" فجرو نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا۔

"فجرو! اس وقت تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں جو چاہو، اختیار کر لو۔ اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کرو میں تمہیں معاف کر دوں گی۔ یا مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کہ تیسری اور کوئی راہ نہیں۔"

"میں تمہیں سوچنے کی فرصت دیتا ہوں اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لو۔"

"فجرو! اگر تم میری غیرت کا امتحان لینے پر تُل چکے ہو تو یاد رکھو اَدَفی بھی اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی ہے۔"

"اَدَفی ضد نہ کرو۔ میں اپنی تمام جائیداد تمہارے نام

منتقل کر دونگا۔ مجھے تجھ ایسی با تدبیر رانی کی اشد ضرورت ہے۔"

" ہائے اللہ! یہ کون درندہ میری عزت پر حملہ آور ہے فجرّو ان غلیظ کلمات کو فوراً واپس لو۔ میں اپنے فخری کی غدار بیوی نہیں ہوں۔ میں فخرِ فخری ہوں۔ دیکھو تم جلد ہی اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جاؤ گے۔"

"میری شان میں یہ گستاخی!! سنو اگر تم نے میرے جذبات کا احترام نہ کیا تو نتیجہ نہایت سنگین ہوگا۔ میرے پاس اس وقت بھی ایسے بہادر ہیں جو اشارہ پاتے ہی تمہاری مشکیں کس لیں گے۔ مناسب ہے کہ تم باعزت طریق پر میرے ساتھ ہو لو۔"

"عزت و ناموس کی حفاظت کے بالمقابل تمہاری یہ دھمکی میرے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اُدفیٰ کی آن کی خاطر ایسی ہزاروں دھمکیاں بھی قربان۔ کیا تو نہیں جانتا

"اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"

اُدفیٰ ابھی "کوتاہی" کا لفظ پوری طرح ادا کرنے نہ پائی تھی کہ درجنوں غنڈوں نے اس کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ صورتِ حال دیکھکر اس نے بھی تلوار سونت لی۔ اور بلند آواز سے کہنے لگی ——" اے بزدلو! آج تم نے اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کے لئے ایک عورت کا انتخاب کیا۔ یہ تمہاری غیرت کا جنازہ ہے۔ لیکن اُدفیٰ کو تم محض ایک عورت نہ پاؤ گے —— ادفیٰ کے بُت میں ایک غیوّر دل ہے۔ ایک ایسا غیوّر دل کہ جس کو برابر تیس سال غیرت و حمیّت کے نہایت مصفّیٰ خون سے سینچا گیا ہے۔" ——

اُدفیٰ اتنے عرصہ میں نصف کے قریب غنڈوں کا صفایا کر چکی تھی۔ غنڈے ایک ایک کرکے بھاگ گئے۔ فجرّو البتہ بنگلہ کی اوٹ میں بیٹھ کر اُدفیٰ کا انتظار کرنے لگا —— اے کاش! ادفیٰ کو گھات کے اس پوشیدہ دشمن کا خیال ہوتا ——————

—— فتحمند ادفیٰ خون سے لت پت بنگلہ کی طرف واپس آرہی تھی کہ فجرو نے گھات سے نکل کر پیچھے سے ایک بھرپور وار کیا۔ ادفیٰ جو زخموں سے پہلے ہی چُور ہو رہی تھی بےبس ہو کر تالاب کے کنارے گر پڑی۔ اس کا خون تالاب میں بہنے لگا —— اتنے میں فخری بھی بیدار ہو چکا تھا۔ باہر نکلا تو اپنے شیر کو کراہتے پایا۔ تب وہ اس بہادر شیر کو اس کمرہ میں لایا جہاں ادفیٰ نے آخری دفعہ اپنے ہاتھوں سے چراغ روشن کیا تھا ——————

—— فجرّو کا یہ آخری گھاؤ جان لیوا ثابت ہوا۔ چند لمحوں کے بعد فخریؔ کے ہاتھوں میں ہی ادفیٰ نے آخری ہچکی لی اور یہ بہادر اور غیوّر خاتون ہمیشہ کی نیند سو گئی —

—— فخریؔ کی آنکھیں اُدفیٰ کے غیوّر چہرہ پر جمی ہوئی ہیں —— آنسوؤں کی بارش تھمنے کا نام نہیں لیتی —— وہ بار بار مُوَفّق خدا سے صبر کی توفیق کی دُعا مانگ رہا ہے ——!! (۷ جنوری ۱۹۷۳ء)

(سہیل بقیہ صفحہ ۵۶)

اور اسکے سینے سے لپٹ گیا —" بابا" میں سہیل ہوں تمہارا بیٹا سہیل" "بیٹا۔ بیٹا۔ سہ۔ سہ۔ سہ۔ سہیل" بابا۔ سہیل کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر پڑا "سہیل! میرے بیٹے سہیل"۔ بوڑھے نے سہیل کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ اس کا جواب دیتا وہ اپنا وعدہ پورا کر چکا تھا۔ وطن کی خاطر قربانی کا وعدہ ——

افسانہ

سہیل

س-ا-بخمی
بی۔ ایس سی سال سوم (آنرز)

"اے میرے وطن کی حسین وادیو! اور سرسبز مرغزارو! آج چودہ سو سال بعد اک بار پھر دشمن تمہیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنی دولت اور طاقت کے نشہ میں چور تمہاری آزادی چھیننا چاہتا ہے۔ مگر نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم ایک آزاد قوم کی آزاد سرزمین ہو اور آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے ——— میں تمہارے لئے ہر قربانی دوں گی۔ اے میرے وطن عزیز! دشمن کے گھوڑوں کو تیری اس پاک سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے میری لاش پر سے گذرنا ہوگا ——— کیا غم ہے جو حوادثاتِ زمانہ نے مجھے بظاہر اتنا کمزور بنا دیا ہے مگر میں تیری ہی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میرا دل اب بھی رستم و سہراب سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ میں تمہارے لئے سب کچھ لٹا سکتی ہوں مگر اپنے جیتے جی تمہاری آزادی کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہرگز نہیں دیکھ سکتی ——— میرے وطن! ابھی تو میرا بیٹا سہیل جوان ہے وہ تیرے لئے ہر قربانی دیگا۔ میرا بیٹا سہیل! میرے شہید وطن کی اکلوتی نشانی!! اس نے تیری ہی اس پاک سرزمین پر جنم لیا۔ اور چند ہی سالوں میں بچپن و لڑکپن کے زمانوں سے گذرتا ہوا آج جوان ہو گیا ہے۔ ہاں۔ ہاں میرے وطن! سہیل اب جوان ہو چکا ہے وہ تیرے لئے ———"

بڑھیا ابھی کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ مگر وطن کی آزادی کے لئے جذبات کے ابلتے طوفان نے اس کی زبان میں اس قدر رقت پیدا کر دی تھی کہ وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور وہ سجدہ میں گر پڑی۔

"ماں" سہیل نے بڑھیا کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"سہیل تم آگئے ہو۔ جنگ کا کیا بنا؟ دشمن پیچھے ہٹ گیا ہے یا نہیں؟" بڑھیا نے یہ سب سوالات نہایت اضطراری حالت میں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالے۔ "ماں"! سہیل نے پریشانی کے عالم میں کہنا شروع کیا "دراصل دشمن کے پاس اسلحہ و بارود کی بہت فراوانی ہے اور دوسرے ان کے علاقہ میں گھنا جنگل ہے جس میں چھپ کر وہ آسانی سے ہم پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیں آج پھر ایک مورچہ ان کے حوالے کرنا پڑا۔"

"سہیل! یہ تم کیا کہہ رہے ہو" بڑھیا نے کڑک کر پوچھا "کیا تم ہوش میں ہو؟" ہاں ہاں ماں! میں ہوش میں ہوں۔ مگر دشمن بڑی تیزی ———"

"بس خاموش رہو" بڑھیا نے سہیل کی بات کاٹ دی ——— "آزادی۔ آزادی قربانی مانگتی ہے۔ وطن کی آزادی چاہتے ہو تو گولے بارود کے طوفان میں سے گذرنا ہوگا۔ آزادی چاہتے ہو تو جان کی بازی لگا کر تلواروں کی دھاروں پر کھیلنا ہوگا سہیل! یاد رکھو دشمن

کے اسلحہ سے متاثر ہو کر ہمت ہار دینے سے ہرگز آزادی حاصل نہ ہو گی۔ غلامی ہاں غلامی کی زنجیروں میں قیامت تک کیلئے جکڑ دیئے جاؤ گے ـــ جاؤ ـــ" ـــــــــــ

ـــــ بڑھیا کی آواز میں ایک غیر معمولی جوش تھا۔" مجھے تم کو سے عزیز اس وطن کی آزادی ہے جس کے لئے تمہارے بزرگوں نے بے دریغ خون دیا۔ اور جس کے لئے آج تک ایک باپ کو اپنے بیٹے اور ایک بیٹے کو اپنے باپ کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا" ـــ "ماں! ماں!! بس اب معاف کر دو" سہیل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ بڑھیا کے قدموں میں گر پڑا ـــــ "ماں۔ اب یا تو دشمن اپنے ناپاک ارادوں سے باز آ جائیگا۔ اور یا پھر میرا وطن میری قربانی قبول کر لیگا ـــ"

★ ★ ★

"چودہ برس!" بوڑھے نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "میرے وطن! تجھ سے جدا ہوئے آج پورے چودہ برس گذر چکے ہیں۔ مگر آج بھی تیری رنگین بہاریں میرے بوڑھے دل میں اسی طرح جاگزیں ہیں ـــ میرے عزیز وطن! آخر تو کہاں ہے۔ میں تو اب چلتے چلتے بھی تھک گیا ہوں۔ چلنا تو درکنار۔ اب تو مجھ میں ہلنے کی بھی سکت باقی نہیں رہی۔ میرے وطن! آخر تو کہاں ہے۔" بوڑھے کی آواز کپکپا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــ میرے مالک۔" بوڑھے نے سجدہ میں گرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "مجھے میرے وطن پہنچا دے ـــــ وطن سے میری مراد گھر نہیں بلکہ وطن کی سرزمین ہے ـــ سہیل کے وطن کی سرزمین ـــــ بغیر وطن کی موت مجھ سے برداشت نہ ہو سکے گی۔ میری روح تا قیامت تڑپتی رہے گی۔ اے میرے قادر خدا! میری دعا کو قبول فرما!" لفظ "سہیل" نے خیمہ کے اندر بیٹھے ہوئے سہیل کو یکدم چونکا دیا۔ اس نے اپنی رائفل سنبھالی اور دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ "بابا" محبت پدرانہ نے جوش کھایا۔ "مگر نہیں۔ جاسوس ـــ دشمن" جوانی کے ابلتے ہوئے خون نے دماغ کو آگ اور کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ یہ ضرور کوئی جاسوس ہو گا۔ جو سہیل کا نام لے کر اس کے جذبات کو مغلوب کر کے اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل چاہتا ہے"

جونہی بوڑھے نے سجدہ سے گردن اٹھا کر پیٹھ موڑی تو اس کی نظر اچانک اس کے اپنے ہاتھ سے گاڑے ہوئے سائن بورڈ پر پڑی ـــ الوطن ـــ "میرے وطن! بوڑھے نے اپنے دونوں بازو کھول لیے اور اس بورڈ کو بوسہ دینے کے لئے کچھ آگے بڑھا ـــ مگر اس کی نظروں نے اسے دھوکہ دیا۔ بوڑھا ابھی کچھ دور تھا اور وہ منہ کے بل گر پڑا ـــ مگر دوسرے ہی لمحہ بوڑھے نے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بورڈ کے دامن کو چومتے ہوئے کہا ـــ" آہ میرے وطن! میرے پیارے وطن! میں آج بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرے کمزور بازو اب تلوار چلانے کے قابل نہیں رہے۔ میری جوانی دشمن کی قید میں بیت گئی ـــ کاش ـــ اے کاش ـــ" اس کی آواز نحیف مگر جوشیلی تھی ـــ "میں تیرے کام آتا۔ اپنے بزرگوں کی طرح میرا خون بھی تیری اس سرزمین پر گرتا ـــ آہ میری بدنصیبی" ـــ "سہیل" ـــ بوڑھے کے خیالات پر ایک بجلی سی گری۔ "میرے وطن! میرا بیٹا سہیل اب جوان ہو چکا ہو گا وہ تیرے لئے سر قربانی دیگا۔ میرے وطن! تو اس کی قربانی ـــ" بوڑھے کے آخری الفاظ اور سہیل کے خون کی روانی میں بہت ہلکی جھجک تھی۔ وہ اور زیادہ دیر نہ سن سکا۔ اور تیزی سے بوڑھے کی طرف بڑھا

(باقی دیکھو صفحہ ۵۱ کالم ۲)

قمرالدین بونا پارٹ
ایف۔ اے سال اوّل

افسانہ

آخری سہارا

خورشید اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اور درختوں کے پتے اس کی حدّت سے جھلس رہے تھے اس وقت ناہید ننھے حامد کو گلے سے لگائے ایک غیر معیّن منزل کی طرف جا رہی تھی۔ وہ چلتی جا رہی تھی — لگاتار — مسلسل — ایک نامعلوم جگہ کی طرف — اس دنیا سے بہت دور — اور اس کی زبان پر یہ دعائیہ کلمات جاری تھے:۔

"اے رحمٰن خدا! میرا اور میرے اس جگر گوشہ کا تو ہی مالک ہے۔ پس تو ہماری مدد کر — اس نے ہمیں چھوڑ دیا اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اے خدا یہ سب باتیں تو جانتا ہے۔ پس تو اپنے فضل سے اب ہماری دستگیری فرما۔"

تپتی ہوئی ریت سے اس کے پاؤں کباب ہو رہے تھے اور چھالے پڑ پڑ کر معدوم ہو رہے تھے۔ مگر وہ تو بڑھتی جا رہی تھی — تیز — بہت تیز —

اچانک کارخانۂ قدرت میں دیر رحمت وا ہوا۔ آسمان پر بادل چھا گئے — بارش برسنے لگی۔ ناہید نے دیکھا کہ قریب ہی ایک مکان ہے — بغیر سوچے سمجھے — وہ اس میں داخل ہو گئی — حامد اس کی گود میں تھا — وہ ایک کونہ میں بیٹھ گئی — ماضی کی یادیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں ابھرنے لگیں —

"وہ ایک امیر اور خوشحال خاندان کی اکلوتی چشم و چراغ تھی — پھر اس نے مڈل، میٹرک، اور ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کی شادی ایک بہت بڑے ڈاکٹر جمال حسن ایم۔ بی بی۔ ایس سے ہوئی۔ تھوڑے عرصہ میں ڈاکٹر صاحب کو دل کی بیماری ہو گئی — وہ وفات پا گئے — ناہید کے والدین بھی وفات پا گئے — اب وہ اکیلی تھی — اس کا کوئی بھی اس دنیا میں نہ تھا — رشتہ داروں نے کچھ مدّت اپنے پاس رکھا اور پھر نکال دیا۔ آج وہ بے یار و مددگار، اس لق و دق صحرا میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جو سوئے ہوئے حامد پر گرے اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی ماں سے دودھ مانگا۔

ماں کے پستان میں بھلا دودھ کہاں؟ عرصہ گذرا اسے تو دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہ ہوتی تھی۔ اس نے کہا "بیٹے ہر وقت دودھ نہیں پیا کرتے — صبح دودھ دوں گی۔ اب سو جاؤ۔"

حامد ماں کے اس دلاسے سے سو گیا۔ مگر آدھی رات کے وقت بجلی چمکی۔ اور بادل گرجے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی عظیم طوفان ہے۔ اور آج کی رات دنیا کو تباہ و برباد کرنے کی ٹھان کر آیا ہو۔ دور کہیں کسی پرانے درخت پر بجلی گری — بجلی کی دہشت سے

بچے کی آنکھ کھل گئی اس نے کہا۔ ابا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بیٹے تمہارے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آتے ہوں گے۔ سو جاؤ میرے لعل"۔۔۔ ناہید کی آواز بھرا گئی ۔۔۔ وہ رونے لگی ۔۔۔

حامد نے ایک دفعہ پھر دودھ مانگا۔ مگر اس دفعہ مادرِ مہربان کا جواب سننے سے پہلے ہی اس کی رُوح اس کے نحیف تن سے علیحدہ ہو گئی۔

ناہید نے حامد کو دلاسہ دینے کے لئے دودھ دینا چاہا۔ مگر اس کا منہ نہ کھل سکا۔ اور کھلتا بھی کیونکر۔ وہ تو ہمیشہ ہمیش کے لئے بند ہو چکا تھا۔ نبض دیکھی تو بند پائی ۔۔۔ "حامد! بس ہو چکی تیری طرف سے بھی وفا!" ۔۔۔ ناہید بے اختیار چیخ اُٹھی ۔۔۔ اس نے دیر تک اپنے جگر گوشہ کو سینے سے لگائے رکھا۔ پھر خود ہی ایک لحد کھودی اور بکمال صبر اور ہمت سے اپنے لعل کو اس میں سُلا دیا ۔۔۔ جب وہ نشانِ حامد پر مٹی ڈال رہی تھی۔ تو یہ کلمات اس کی زبان پر تھے:۔

"اے خدا! تیری قدرتوں کے قربان!! تُو نے پہلے میرے ماں باپ اور پھر میرے خاوند کو مجھ سے چھین لیا۔ اور اب میرے پاس بس صرف یہی تھا جس پر میری امیدیں وابستہ تھیں اور تو نے اسے بھی چھین لیا۔ اے خدا! میں کیا کروں۔ اب میں ۔ ۔ ۔ ۔ زندہ ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ رہ سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ضرور اپنے بیٹے اور خاوند کے پاس جانا چاہیئے ۔۔۔ اے میرے بیٹے تو خدا کے سپرد۔ میں نے تو تم کو آخری سہارا سمجھا تھا مگر تو نے میری کوئی وقعت نہیں سمجھی اور مجھے چھوڑ کر چلا گیا ۔۔۔ اے میرے بیٹے تو خدا کے سپرد تو چل میں بھی تیرے پیچھے آتی ہوں"۔

اس کے بعد اس نے کہا:۔

"اے میرے رشتہ دارو! میں تم سے رخصت ہوتی ہوں ۔۔۔ اے وہ سرزمین! جس پر میں پیدا ہوئی ۔۔۔ اور جس پر میں نے اپنی زندگی کی کئی سہانی بہاریں دیکھی ہیں ۔۔۔ اور اے مکان! جس نے مجھے پناہ دی ۔۔۔ تیرا صد ہزار شکریہ۔ میں تم سب سے رخصت ہوتی ہوں۔ اے میرے بیٹے! نامعلوم میری لاش کہاں کہاں بھٹکے گی میں تجھ سے رخصت ہوتی ہوں۔ اے ہوا! جو کہ آسمان کو پرواز کر رہی ہے۔ میرے والدین۔ میرے جگر گوشہ اور میرے خاوند کو خدارا یہ تو بتا دو کہ ناہید آ رہی ہے"۔

اس کی ہچکی بندھ گئی۔ قدرت کی ستم ظریفی اس منظر کو دیکھ کر چیخ اُٹھی ۔۔۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اپنی خواہش کے مطابق عالمِ جاودانی کو سدھار چکی تھی۔

حکمت کے موتی

- گھاس کے کمزور تنکوں سے بنی ہوئی رسی کنوئیں کی پتھریلی منڈیر کو کاٹ دیتی ہے بار بار کی رگڑ سے۔ (بالڈون)
- انسان اپنی محنت، قابلیت اور جدوجہد سے سوائے نبی کے سب کچھ بن سکتا ہے۔ (ٹیگور)
- غصہ اور ضد کی بنیاد پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں وہ پانی پر رنگ کی دیواریں ہوتی ہیں۔ (ڈاکٹر ہیوگ)
- کوئی شیشہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر پیش نہیں کر سکتا جتنی اس کی بات چیت۔ (بین جونسن)

(مرسلہ: ایم۔ جے۔ حزیں)

محمد اسلم ظفر
ایف۔ اے سال دوم

طنز و مزاح

سرقہ کی ایک ناکام کوشش

★ ــــــــــــــــــــ ع۔۔ "اے آزمانے والے یہ نسخہ نہ آزما"!

خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ اس واقعہ کو پورے تین سال بیت چکے ہیں ـــ لیکن آج جب میری "گردشِ ایام" اس کی روداد لکھنے کے لئے "پیچھے" کی طرف دیکھ رہی ہے تو میرے رونگٹے "بلا اجازت" کھڑے ہوتے جا رہے ہیں ـــ اور یہ مصرع بے اختیار میرے منہ سے نکل رہا ہے ـــ بلکہ میں اسے گنگنا رہا ہوں۔ ع

"اے آزمانے والے یہ نسخہ نہ آزما!"

اس قسم کے حادثات کی تفصیل دوسروں کو بتانے کے لئے بڑی جرأت درکار ہوتی ہے۔ میں نے آج یہ جرأت اس لئے کی ہے تا دوسرے لوگ (جو اس فن میں پی۔ ایچ۔ ڈی حاصل کرنے کی امیدیں لگائے ہوئے ہیں) میرے اس واقعہ سے درسِ عبرت حاصل کریں اور اس سے پہلے کہ "اولے پڑیں" ان کی غیر محفوظ "منڈوں" پر بالوں کا "محافظ دستہ" آگ آنا چاہیئے۔ مقصد مختصراً آج کی "تکلیف برداری" کا نیتوں کے "فتور" کو درست کرنا اور انھیں نکھری اور صاف بنانا ہے۔

چشم بد دور ہمارا سکول تمام سکولوں کی نسبت "ادب" کا کچھ زیادہ ہی "خدمت گذار" ثابت ہوا تھا۔ تمام ادبی محفلوں اور مشاعروں کے علاوہ سکول کے "ہونہار بردا" ایک سہ ماہی ادب پارہ موسوم بہ "شبنم" بھی نکالا کرتے تھے۔ سکول کے ہر طالب علم کی یہ "میٹھی خواہش" ہوتی کہ "شبنم" کے لکھنے والوں میں اس کا نام بھی آجائے۔ لیکن یہ مسلمہ اصول ہے کہ جہاں اخلاص اور محبت سے کام کرنے والے ہوتے ہیں وہاں "بلیک شیپ سپرٹ" کے پرچم بردار بھی مل جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم ان دنوں اپنے آپ کو ذہنی طور پر مؤخر الذکر گروہ میں شامل کرتے تھے۔ یا یوں کہیئے کہ "رضا کارانہ" طور پر "مجبوراً" اس گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ "فکری توپ" کچھ ایسے "ناکارہ" تھے کہ ان کو تکلیف دینے کا "محاورہ" ہماری "ڈکشنری" میں راہ پانے کا "خواب" بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تو صاحب۔ متذکرۃ الصدر "میٹھی خواہش" کو پورا کرنے کے لئے ہم نے اپنی "دماغی قوتوں" کو پریشان کئے بغیر چار فل سکیپ صفحات پر مشتمل ایک اچھا خاصا عالمانہ مضمون "داغ مارا"۔ "طلبہ کا سیاسیات میں حصہ" اس مضمون کا عنوان تجویز کیا۔ ان دنوں یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان خاصہ موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ "وقت کی آواز" پہ یہ عالمانہ مقالہ ایڈیٹر صاحب "شبنم" کے سپرد کیا۔ اور پرچے کے شائع ہونے کا اس شدّ و مد سے انتظار کرنے لگا۔ گویا اپنا ہی خون پسینہ ایک کر کے یہ دستاویز لکھی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ چوری پکڑی نہ جاتی۔ تو سکول کی سالانہ تقریب پر مجھے سال کا بہترین مضمون نگار ہونے کے لحاظ "نوبل پرائز" دیا جاتا۔ خیر

ع ـــ یہ نہ تھی ہماری قسمت ـــ "شبنم" آخری مرحلوں سے گذر رہا تھا۔ اور ہم یہ تمام "دکھال" امید سے "لاکاتیب" کی

"نوکِ قلم" محمد اسلم ظفر سے ضرور بالضرور واقف ہو گئی ہوگی

اسی اثناء میں مدیر رسالہ کی طرف سے نوٹس بورڈ پر یہ اعلان نظروں سے گذرا — "محمد اسلم صاحب ظفر فوری طور پر مجھے "دفتر شبنم" میں ملیں" — اعلان پڑھا۔ تو سہل انگاری کی عادی "فکری قوتوں" میں بھی حرکت آ گئی۔ کہتے ہیں "حرکت میں برکت ہے" شاید درست ہی ہو۔ ہمارے مشاہدے میں تو یہ آیا ہے کہ "حرکت میں شامت ہے" ہمارے قوتوں میں جو حرکت آئی تو "برکت" کو بھی "اُلٹی" ہی معلوم ہوتا ہے۔ حرکت کا رُخ "الٹا" تھا —

قصہ کوتاہ۔ اعلان پڑھ کر سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ مدیر صاحب کو ہم سے کیا کام پڑ گیا؟" آخر کار یہی چیز ذہن میں آئی کہ معاملہ ضرور مضمون کا ہے۔ شاید مدیر صاحب شک میں پڑ گئے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں اور کوئی بات آ ہی نہیں سکتی تھی — بحفاظت تمام مدیر صاحب کے دفتر میں پہنچا۔ انہوں نے پرسشِ احوال کے بعد کرسی پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا — میں اسے "کنایہ" سمجھا۔ بیٹھ تو گیا۔ مگر کسی پوشیدہ احساس کے باعث ہوش و حواس اپنے بس میں نہ تھے۔ یعنی دماغ کی "کنٹرولنگ مشینری" میں خرابی پیدا ہو چکی تھی۔ مدیر صاحب نے گفتگو کا آغاز اس فقرہ سے کیا۔ "میں آپ کو آپ کے مضمون پہ خراجِ تحسین ادا کرنا چاہتا تھا" کہتے ہیں جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ آبادیوں کا رُخ کرتا ہے۔ میرے خیال میں جب کسی چور کی شامت آتی ہے۔ تو اسے سیدھی اور سادہ باتیں "اُلٹی اور پیچیدہ" نظر آتی ہیں — نہ معلوم انہوں نے یہ جملہ کتنے اخلاص سے کہا۔ لیکن یار لوگوں کے کان" بھی اس وقت "منافق" ثابت ہوئے۔ یوں معلوم ہوا گویا مدیر صاحب نے یہ فقرہ ادا کر کے میرے ادبِ طنز" کا ایک بہت بڑا پہاڑ گرا دیا ہے — لگا "بحرِ بوکھلاہٹ" میں ڈبکیاں لینے — بلا اختیار دو تین دفعہ لڑکھڑاتے ہوئے انداز میں نکل گیا "لیکن میں نے تو یہ مضمون از خود لکھا ہے" مدیر صاحب کچھ ذہین تھے میرے ان فقرات سے سمجھ گئے کہ بلا استفسار "داڑھی میں تنکے کی تلاش" صاف بتا رہی ہے کہ "دال" میں کچھ "کالا کالا" ضرور ہے۔ خیر بعد اس کے انہوں نے صرف یہی کہا کہ "شکریہ! آپ جا سکتے ہیں" بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میرے زورِ تحریر سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ مجھے "ادارۂ تحریر" میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے

مدیر صاحب کی "حسنِ ظنی" میں جو ہنگامہ آرائی ہوئی تو انہوں نے تفتیش شروع کر دی۔ اپنے حلقۂ واقفیت میں انہوں نے سب سے پوچھا کہ کبھی کسی کتاب یا رسالہ میں "طلبہ اور سیاست" پر کوئی مضمون پڑھا ہو۔ کافی "نشان دہیاں" کی گئیں۔ لیکن "مسروقہ مال" کی کھوج لگانے میں سوائے "خفیف توارد" کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آخر ایک دن مدیر صاحب کے ایک پرانے رفیق کار جو اردو ادب سے بڑا شغف رکھتے تھے کہنے لگے۔ کہ دو سال گذرے ہیں نے اردو ادب کی ایک گائیڈ میں ایسے ہی نفسِ مضمون کی ایک تحریر پڑھی تھی اس میں دیکھ لینا چاہیئے۔ (بعد میں یہ حادثاتی کھوجی میرے بڑے یار بن گئے تھے۔ ویسے میں جب بھی ان سے ملتا ہوں میری پیشانی پر پسینہ آ جاتا ہے) خیر لائبریری سے رابطہ قائم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک پرانی گائیڈ اس لائبریری میں ہے تو ضرور مگر وہ محمد اسلم ظفر ایک طالب علم کے نام

جاری ہے۔ اس اطلاع سے مدیر صاحب کی "شک کی جڑیں" اور بھی گہری ہو گئیں۔ اسی دن لائبریرین صاحب کی طرف سے میرے نام یہ نوٹس "نمودار" ہوا۔ کہ آپ کتاب "اردو گائیڈ مطبوعہ ایم۔ آر۔ برادرز" فوراً واپس کر دیں۔ سخت ضرورت ہے۔ بادلِ ناخواستہ و برداشتہ کتاب اگلے روز واپس کر دی۔ مدیر صاحب نے مضمون تلاش کر کے اس کا "میرے شاہکار" سے مقابلہ کیا۔ الف سے لیکر ی تک فرسٹ کلاس "نقل مطابق اصل" پائی گئی۔ ایک آدھ جگہ پر صرف اتنا فرق تھا۔ جیسے کوئی محمد اسلم ظفر کی بجائے تعریف کیا گیا "اسلم فتح" کہیے

خیر اسی دن تقریباً بارہ بجے نوٹس لگا۔ کہ اسلم ظفر صاحب فوراً "مدیر شبنم" سے ملیں۔

ملنا تو ہم نے کیا تھا۔ بیماری کا بہانہ بنایا اور ٹیچر انچارج سے چھٹی لے کر سیدھے گھر پہنچ کر سانس لیا۔ تمام دن سخت پریشانی اور بے چینی و اضطراب میں گذرا۔ میں "رات پڑنے" کی خواہش کروں اور دن "ختم ہونے کو نہ آئے۔ میری سست دماغی رگیں اس مسئلہ کا کوئی حل پیش نہ کر سکیں۔ شام ہوئی تو ایک طالب علم نے سرخ رنگ کا ایک لفافہ جو کہ واضح طور پر "خطرہ کا نشان" معلوم ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ مدیر صاحب کی جانب سے مجھے لکھا ہوا تھا ـــــ وجوہ بیان کریں کہ کیوں نہ "سرقہ کی ایک ناکام کوشش" کے الزام میں آپ کو تادیبی کارروائی کے لئے صدر مدرس کی خدمت میں پیش کیا جائے؟" اس "ناگہانی پرچۂ امتحان" کا جواب میں نے اس کی پشت پر یہ لکھا "اگر وجوہ لکھنے کے قابل ہوتے تو مضمون بھی خود ہی لکھ لیتے۔ "ستر سال بوڑھی گائیڈ" کی مدد لینے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے پاس تو یہی ایک وجہ بیان کرنے کو ہے و بس۔ مدیر صاحب اس جواب سے بہت برہم ہوئے۔ اگلے روز صبح ہی صبح ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں "پیشی" ہو گئی۔ مدیر صاحب مدعی کی حیثیت سے آئے۔ واقعات کے تمام "مالہٗ و ما علیہ" ہیڈ ماسٹر صاحب کے گوش گذار کر دیئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ "مقدمہ" "سپریم کورٹ" میں لانے کے قابل نہیں ہے۔ "طلبہ کی زیریں عدالت" میں پیش کیا جائے۔ اس عدالت کے جج ہیڈ ماسٹر صاحب کے اپنے نامزد کردہ ہوتے تھے۔ ہر کلاس کا ذہین ترین طالب علم "اس جیوری" کا رکن ہوتا تھا۔ اگلے روز "اس ننھی عدالت" میں پیشی کا "سمن" آگیا۔ ان ننھے ججوں کا فہم و فراست آج بھی مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ مدعی کا بیان ہوا۔ مدعا علیہ کا ہوا۔ صفائی اور استغاثہ کے گواہوں کے بیانات ہوئے۔ تیسرے دن پورے تین صفحات پر مشتمل رپورٹ سکول کی "سپریم کورٹ کے چیف جسٹس" جناب ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی۔

رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ واضح شواہد کی روشنی میں مسمیّ محمد اسلم ظفر کو "زبردست ادبی سارق" قرار دیا جاتا ہے فیصلہ کے اختتامی فقرات مجھے اب بھی یاد ہیں ـــــ "طلبہ کی یہ ننھی عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ ملزم اسلم ظفر کو سزا کے طور پر مجبور کیا جائے کہ وہ "اس سرقہ" کی تمام روداد قلمبند کر کے مدیر صاحب "شبنم" کے حوالہ کر دے۔ اور وہ روداد اسلم ظفر کی طرف سے رسالہ میں شائع کی جائے۔ عدالتی کارروائی کے دوران ججوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ملزم اسلم ظفر کو اپنے نام کی "سستی اشاعت" کی بہت شدید خواہش ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ "والہانہ شوق ہے۔" پس اس شوق کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے۔ نیز یہ مشورہ بھی دیا جاتا ہے کہ "اس روداد" کے ساتھ ہی "تتمہ" کے طور پر عدالت ہذا کا فیصلہ بھی شائع کیا جائے" ـــــ میرا پیغام ہر اس شخص کے نام جو کوئی **

** ایسا سرقہ کر چکا ہے یا کرنیکا ارادہ رکھتا ہے یہ ہے کہ جو اسے آزمانے والے یہ نسخہ نہ آزما۔

ممتاز احمد
ایف۔ اے سال دوم

طنز و مزاح

مردِ سیاست سے ایک انٹرویو

عنوان میں لفظِ "مردِ سیاست" کی عمومیت دیکھ کر آپ خیال کر رہے ہوں گے کہ شاید میں آپ کی خدمت میں ملکی یا غیر ملکی سطح پر کسی بڑے سیاستدان سے انٹرویو پیش کرنے والا ہوں لیکن میں اپنے معزز قارئین سے معذرت کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ "فدوی" کو آپ کی اس خیال افروزی سے اتفاق نہیں۔ ہمارا "مردِ سیاست" "کالج کا مردِ سیاست" ہے یعنی ان کا حلقۂ واقفیت صرف "کلیاتی سیاست" تک ہی محدود ہے۔

پچھلے اکتوبر مجھے ایک الیکشن کے دھندے میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ دورانِ ملاقات میں نے ان سے متعدد سوالات کئے۔ میرے ایک دوست مبارز صاحب جنھیں سٹینو بننے کا بڑا شوق ہے ان سوالات کے جوابات نوٹ کرتے رہے انھیں نوٹوں کو ترتیب دیکر آپ کی خدمت میں "انٹرویو" کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ کہیں کہیں جوابات کے پیروں میں خالی جگہیں رہ گئی ہیں۔ یہ ہمارے سٹینو کی نابلدی اور فن میں ابتداء کا نتیجہ ہیں۔ اس کے لئے ہم جہاں ایک طرف معذرت خواہ ہیں وہاں دوسری طرف خوش بھی ہیں۔ کہ اگر "ضرورتمندوں" نے ان خلاؤں کو پُر کروانے کی حماقت محسوس کی تو مردِ سیاست کی "خالص آمدنی" میں انشاءاللہ کافی اضافہ کی توقع ہے۔ کیونکہ آجکل وہ "کالج پالی ٹیکس" پر بغیر فیس کے بات نہیں کرتے۔ ہم بھی بددعاؤں سے بچ جائیں گے ورنہ انٹرویو کی اشاعت کے بعد ان کی ضرورت کم ہی پڑنی تھی۔ "زیارت لیکس" حرام سمجھتے ہیں ورنہ "دائرہ زیارت" تو کافی وسیع ہو سکتا ہے۔ مشوروں کی فیس کو صرف حق سمجھکر لیتے ہیں۔

انہیں ملنا ہو تو نوٹ کر لیجئے۔ کہ قصبہ کے غربی جانب ایک مکان ملے گا جس کے "سائن بورڈ" پر "ایم۔ ایم رشدی بی۔ اے۔ سی۔ پی" لکھا ہوگا۔ آپ کو سی۔ پی کے اعزاز کا علم نہ ہوگا۔ میری خواہش پر انہوں نے اس "کمیاب اعزاز" کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا "جس طرح سی۔ ٹی تعلیم دینے کے ماہر ہوتے ہیں، سی۔ پی سیاست پلانے میں حاذق مانے گئے ہیں"۔ بتانے لگے "ہمارے زمانہ میں کالج میں یہ رول تھا کہ جو طالب علم چار تعلیمی سالوں میں سے تین سال مسلسل کسی نہ کسی انتخاب میں کامیابی حاصل کرلے وہ اپنے نام کے بعد سی۔ پی کے الفاظ لکھ سکتا تھا اور یہ مخفف ہے "سرٹیفکیٹڈ پالی ٹیشن" کا۔ بہت کم طلبہ کو یہ اعزاز نصیب ہوا ہے۔ اِلّا ماشاءاللہ"۔

تو لیجئے ان بر سبیل تذکرہ امور کے بعد انٹرویو ملاحظہ فرمائیے۔

میں:۔ سلام سیاست قبول ہو رشدی صاحب! کہئے طبیعت تو اچھی ہے؟

رشدی صاحب:۔ اللہ کا شکر ہے ممتاز صاحب! آئیے تشریف رکھیئے۔ کل ہی توفیق صاحب آپ کا تذکرہ

کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے: "آجکل "میدانِ سیاست" میں کودنے کے لئے "پراسپکٹس" کی تلاش میں ہیں۔ بڑی حسرت سے کہہ رہے تھے کہ کسی آزمودہ کار پہلوان" سے ایکسی ڈنٹلی" یعنی ٹکراؤ ہو جائے!!

———— تو بس مزا ہی آجائے۔ فتح ہماری ہی ہوگی"۔ میں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ عزیز کو میرے پاس بھیج دیجئے گا۔ اُسے "تجارت" کے تمام قیمتی راز انہیں "فری" بتادونگا۔ ....!!

میں:۔ بہت بہت شکریہ رشدی صاحب کرم نوازی کا۔ آپ تو ماشاء اللہ اسم بامسمّٰی ہیں۔ توفیق صاحب ہی بتا رہے تھے کہ قصبہ میں ان معاملات میں آپ سے بڑھ کر کوئی "صائب الرائے" نہیں مل سکتا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ کچھ داؤ پیچ سیکھ لوں، تاکہ "بوقت مصیبت" کام آئیں۔

رشدی صاحب:۔ بڑے شوق سے میاں ...... ہمارے بتائے ہوئے "نسخوں" سے بفضلہ تعالیٰ "بہتوں کا بھلا" ہوا ہے۔ بڑے بڑے "خرانٹ" بھی ہماری خدمات کو حاصل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں...... "سیاسی قلابازیوں" کے بارہ میں جو "منفرد بندی" ہم سے ظہور میں آتی ہے۔ ہرایرے غیرے کے بس کی بات نہیں۔ یقین کیجئے کبھی کبھی یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سیاست اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ہماری ذات میں "حلول" کر آئی ہے ....!!

میں:۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔ اچھا تو رشدی صاحب آپکو یہ سیاسیات میں حصّہ لینے کا شوق کب اور کیسے چرایا؟

رشدی صاحب:۔ ممتاز میاں "یہ کب اور کیسے" کی بھی بڑی دلچسپ داستان ہے۔ "ہماری سیاسیات کی "کب" تو پرائمری سکول میں ہی شروع ہوگئی تھی اور "کیسے" کا آغاز بھی وہاں سے ہی ہوا ....

ہر سال سکول کی "بزمِ ادب" کے لئے لڑکوں کے بڑے سے بڑے عہدے یعنی سیکرٹری کا انتخاب ہوا کرتا تھا۔ اور یہ سیکرٹری پانچویں جماعت سے لڑکوں کی کثرتِ رائے سے منتخب کیا جاتا تھا....

پہلی جماعت سے ہی میرا یہ مشاہدہ تھا کہ سیکرٹری کی تمام سکول میں بہت آؤ بھگت ہوتی تھی۔ لڑکے اس کی عزّت کرتے۔ استاد اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب کوئی افسر سکول کا معائنہ کرنے آتا تو سیکرٹری صاحب بھی استادوں کے دوش بدوش "تقریبِ استقبال" میں شریک ہوا کرتے۔ پھر اس کا تعارف بھی افسر صاحب سے بڑے اہتمام سے کرایا جاتا۔ تمام ڈنروں اور پارٹیوں میں اس کو مدعو کیا جاتا۔ غرض سیکرٹری کی یہ تمام عزّت و تکریم دیکھکر ہمارے دل میں گدگدیاں ہونے لگتیں ذہن "کاش کاش!!" پکار اٹھتا۔ اور "کاش کاش" کی اس پُرحسرت پکار کا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے یعنی ...... "پیٹ" قدرت نے بغیر حدودِ اربعہ کے عطا فرمایا تھا۔ سیکرٹری کو ڈنروں میں مدعو پاتا تو اس وسیع و عریض دفینہ میں چوہے "ڈانس" کرنے لگتے۔ بس صاحب اُس "کاش کاش" سے ہماری "کیسے" کا آغاز ہوا ....

پانچویں میں ہوئے تو قسمت نے یاوری کی۔ یار لوگوں نے بلا مقابلہ اپنا سیکرٹری بنا لیا۔ یہ تھی ہماری "کب" کی ابتدا۔۔۔ بس پھر یہ اقتدار کی مے کچھ ایسی منہ لگی کہ پھر نہ چھٹی۔ کبھی "شوقِ سیاست" ہم کو جا لیتا اور کبھی ہم اسے "اینٹھ" لیتے۔

میں:۔ حبّذا! رشدی صاحب! تو نتیجہ اس کہانی کا یہ نکلا کہ الیکشن لڑنے سے پہلے امیدوار کی "اشتہائے سیاست" اور "ہوسِ گدّی" خوب بھڑکی ہونی چاہیئے۔

رشدی صاحب:۔ بالکل درست سمجھے آپ۔ "بھوکے شیر" کی لڑائی مشہور ہے۔

میں:۔ اچھا تو رشدی صاحب یہ بتائیے کہ آپ نے کتنے الیکشن ہارنے کی "سعادت" پائی؟

رشدی صاحب:۔ ارے! اور پھر آپ نے "سعادت" سمجھا۔ بڑے گہرے "فلسفہ" میں چلے گئے ممتاز صاحب آپ!! یہ درست ہے کہ زندگی کا ہر سبق "سعادت" ہے۔ ہارنے میں بھی کچھ سبق پنہاں ہیں۔ اور اس مناسبت سے ہارنے کو "سعادت" سے تعبیر کرنا چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ روبہ مطلب "سکول لائف" کے الیکشن تو بڑے ہلکے پھلکے ہوتے تھے۔ شروع سے آخر تک "اجارہ دار" بنے رہے۔ کالج لائف میں "پھولوں کی یہ سیج" کانٹوں سے بنے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ سکول لائف کی غلط فہمی یہاں رنگ لائی۔ پہلے ہی مقابلہ میں "کھیت" رہے۔ الیکشن آفیسر نے میرا نام بولا تو مجھے ووٹ تو کیا ملنے تھے کالج ہال کی دیواریں بھی منہ چڑا رہی تھیں۔ ان دنوں ابھی کلیاتی علاقوں میں "بیلٹ سسٹم" کا بول بالا نہیں تھا۔ "ہینڈز اَپ" سے ہی کام لیا جاتا تھا۔ ہمارا حشر یہ ہوا۔ کہ مجوّز اور مؤیّد تک بھی "موقعہ" پر موجود نہ تھے۔۔۔ قہرِ درویش برجانِ درویش۔۔۔ الیکشن آفیسر نے اس سب کچھ کو "شرارت" کا نام دے کر تمام لڑکوں کے سامنے میرے خلاف یہ تعزیر لگائی کہ مسٹر رشدی کو پچاس روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ نیز اس سال کسی بھی سائیڈ کا انتخاب لڑنے کے لئے نااہل قرار دیا جاتا ہے۔۔۔۔

بس یہی میرا پہلا اور آخری الیکشن ہے جس میں ہارنے کی "سعادت" نصیب ہوئی۔

میں:۔ آپ تو ماشاءاللہ "ایبڈو گزیدہ" بھی ہوئے۔

رشدی صاحب:۔ دریں چہ شک؟

میں:۔ رشدی صاحب آپ نے کئی انتخاب جیتے۔ کسی ہارے ہوئے مدِمقابل کی حالت کا نقشہ کھینچئے!

رشدی صاحب:۔ یہ لمحے ممتاز صاحب بڑے تلخ ہوتے ہیں۔ اس وقت کم از کم منہ سے یہ دعا ضرور نکلتی ہے کہ خدا دشمن کو بھی یہ لمحات نہ دکھائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نیم یا حنظل کا پانی پلا رہا ہے جو بمشکل تمام حلق سے نیچے اتر رہا ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ میری اپنی تو یہ حالت ہوئی تھی۔ کہ احساسِ شکست سے آنکھیں اس قدر بوجھل ہو گئیں کہ پلکیں جھپکنا دوبھر ہو گیا تھا۔ بار بار ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ آ رہا تھا۔ میں جس قدر اپنی خفگی کو لوگوں سے چھپاتا وہ اسی قدر زیادہ چہرہ پر نمایاں ہو جاتی دل کو بہتیرا سمجھاتا کہ کوئی بات نہیں، گرتے ہیں شہسوار ہی۔۔۔۔ لیکن اس دن تو اسے سمجھا آتا ہی

دنخفا۔ کامیاب حریف کو مبارک دی مگر اس طرح جیسے "بھیگی بلّی میاؤں کر رہی ہو ...... اب ایک واقعہ ہمارے حریف کی شکست کا بھی سن لو۔ جب دیوتائے انتخاب نے میری کامیابی کا اعلان کیا۔ تو صاحب برہم ہو بیٹھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً فتویٰ کس دیا۔ "جا میں نہیں تیرے نال بولنا۔ توں میرے نال بڑا دغا کیتا اے۔ بڑا چالباز ہیں تے بڑا چار سو ویہی ہے توں میرے بہترین ووٹاں نوں اڈے نہ لگاندا تے کدی وی نہ جت سکدا"۔ ان الفاظ سے آپ ہارے ہوئے امیدوار کی بوکھلاہٹ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یقین جانیئے وہ صاحب پورے نوّے روز مجھ سے خفا رہے۔ میں سلام کرتا۔ وہ مجھے آنکھیں نکالتے میں دوستی کا اظہار کرتا وہ کہتے تو میری تحقیر کرتا ہے۔ ایسے بھی اللہ لوگ ہوتے ہیں۔ ویسے متفق علیہ رائے یہ ہے کہ ہزیمت خوردہ امیدوار کا پہلا دن "بدہضمی" میں گذرتا ہے واقعہ کے "عمر رسیدہ" ہونے کے ساتھ ساتھ نظامِ ہضم بھی درست ہوتا جاتا ہے۔ ایسے امیدواروں کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ ان کا دماغ سبکی سے بچنے کے لئے "سائنٹیفک بہانے" تراشنے میں بڑا ماہر ہو جاتا ہے ......"

میں:۔ شکریہ رشدی صاحب! اب یہ بتایئے کہ کامیاب امیدوار پر کیا گذرتی ہے؟

رشدی صاحب:۔ آہا! ہا! ہا!!! ناکامی جس قدر تلخ ہوتی ہے کامیابی اسی قدر شیریں اور پُرکیف۔ اگر کوئی کامیاب خدانخواستہ "مریض" ہو تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کامیابی اس کے لئے بہترین ٹانک اور زبردست اکسیر ثابت ہو۔ دورانِ خون اس قدر تیز ہو جاتا ہے، کہ چہرہ پر "گلاب کے پھول" روپ دھارنے لگتے ہیں۔ اور صاحب باطنی فرحت و سرور کے کیا کہنے۔ دل خوشی و مسرت کے بحرِ بیکراں میں تیرنے لگتا ہے۔ احساسِ اقتدار سے باچھیں کھلی جا رہی ہوتی ہیں۔ مبارکبادیں مل رہی ہیں۔ مصافحے معانقے ہو رہے ہیں —— اور ہاں کبھی کبھار "ٹاٹ شاپ" کی صدا بھی بلند ہو جاتی ہے۔ جس کے سننے پر امیدوار کو اپنی جیب پر پہرہ بٹھانے کی فکر پڑ جاتی ہے۔ بعض نے ماشاء اللہ کافی بھاری منتیں بھی مانی ہوتی ہیں۔ ہمیں بعض ایسے دوستوں کی مثالیں یاد ہیں جنہوں نے اپنی منتّوں سے وہی سلوک کیا جو "کھجور پہ چڑھے پٹھان" نے کیا تھا۔

میں:۔ الیکشن میں کامیابی کا کیا راز ہے رشدی صاحب؟

رشدی صاحب:۔ موقعہ و محل کے مطابق کامیابی کے کئی "راز دریافت" کئے گئے ہیں۔ ایک بڑا راز تو خود آپ کی شخصیت ہے۔ آپ کی ذاتی جاذبیت اور کشش بہت اثر رکھتی ہے اس کے علاوہ آپ کی "جیب" میں بھی ایک راز ہے۔ آپ کی زبان میں بھی ایک راز ہے۔ آپ کے "کنویسنگ پروگرام" میں بھی ایک راز ہے اور کنویسنگ کے معاملہ میں "راز در راز" یہ ہے کہ آپ کو چند مخلص دوستوں کا دستِ تعاون حاصل ہو۔ مردِ سیاست کی اس بات کو خوب یاد رکھیں کہ خود غرض، موسمی اور پیٹو قسم کے رفیق کار عموماً امیدوار کی شکست کے نشان ہوتے ہیں۔ کم از کم

ہمارا تجربہ تو یہی ہے۔ اور بھی کئی راز ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ بعض "نیاز" لگے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں ان کی فی الحال آپ کو ضرورت نہیں۔۔۔۔۔۔!!

میں :۔ سی۔ پی صاحب! کنویسنگ کا آغاز کب کرنا چاہیئے؟

رشدی صاحب :۔ اصل میں تو آپ کی ساری زندگی ہی "کنویسنگ" ہے۔ آپ کی قوتِ عمل میں سب سے بڑی قوت متاثرہ پائی جاتی ہے۔ سو یہ کنویسنگ تو ساری عمر جاری رہتی ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں کنویسنگ کا موسم بہار "ستمبر" میں شروع ہوتا ہے اور وسط اکتوبر میں پورے اوج پر ہوتا ہے۔ اواخر اکتوبر تمام پھل اور پھول ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اس موسم میں کسی قسم کی سستی اور تساہل امیدوار کی کامیابی کے لئے "سمِ قاتل" کا حکم رکھتا ہے۔ وعدوں کی تجدید اور یاد دہانیاں بہت ضروری ہیں۔ خرگوش قسم کے امیدوار ایسے موقعوں پر عموماً لگاتے ہیں رہتے ہیں اس موسم میں تو کچھوے سا صبر و استقلال کام آتا ہے! الیکشن جیتنا ہے تو کچھوے بن جاؤ۔ اپنا سفر جاری رکھو۔ اگرچہ آہستہ آہستہ۔

میں :۔ فرسٹ ایئر کو کنویس کرنے کا کیا طریق ہونا چاہیئے؟

رشدی صاحب :۔ ان کو قابو میں لانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے بعض کھیپیں تو ایسی آجاتی ہیں جن میں بھیڑ چال کی عادت ہوتی ہے۔ بعض آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی خصوصیات رکھتی ہیں ـــــ جدھر ڈھلوان ملا اسی طرف بہہ گیا ـــــ ہوشیار قسم کے لوگ سکول کی آخری کلاس سے وہاں ہی ملاقاتیں شروع کر دیتے ہیں ـــــ کسی سکول ماسٹر سے دوستی بہت فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ لیکن اس بارہ میں اختلاف رائے ہے۔۔۔۔۔۔!!

میں :۔ رشتہ داریوں کے کردار پر بھی کچھ روشنی ڈالیئے۔

رشدی صاحب :۔ ہاں یہ اہم چیز تو میں بھول ہی گیا۔ ایسے موقعوں پر بڑی دُور دُور کی رشتہ داریاں "کریدی" جاتی ہیں۔ کسی کو "فرسٹ کزن" ثابت کیا جا رہا ہے۔ کوئی "سیکنڈ کزن" بن رہا ہے۔ باپ دادوں کے پرانے تعلقات یاد کرائے جا رہے ہیں۔ اور بعض رشتہ داریوں کے درمیانی لنک (مسنگ لنک) کا فاصلہ اس قدر لمبا ہو جاتا ہے کہ نیویارک اور لنڈن تک کے قلابے ملانے پڑتے ہیں۔ قومی غیرتوں کو بھی اس موقعہ پر بھی خوب ابھارا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں "جٹ پارٹی" کے سہارے الیکشن جیتا۔

میں :۔ الیکشن میں کامیابی کی واضح پیشگوئی کب کی جا سکتی ہے؟

رشدی صاحب :۔ جب آپ کے دوست آپ کو الیکشن لڑنے کے لئے مجبور کریں اور آپ تیار نہ ہوں۔ ان حالات میں آخر کار تیار ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ پھر آپ کے دوست اپنی ناک کی خاطر اس اخلاص سے آپ کی حالی و قالی و مالی مدد کریں گے۔ کہ آپ کے ننانوے فیصد کامیاب ہونے کا امکان ہو جاتا ہے۔ اس سے کچھ زیادہ یعنی $99\frac{9}{10}$ فیصد امکان اس وقت ہوتا ہے جب آپ کا کوئی بھی مدمقابل نہ ہو۔ ایک فیصد کے $\frac{1}{10}$ کے متعلق یہ عرض ہے کہ "جائے ڈسکوالیفکیشن خالی است"!!

میں :۔ اچھا تو آپ مقابلہ زیادہ پسند کرتے ہیں یا

ع:شرکت غیرے انتخاب کے حامی ہیں؟

رشدی صاحب :- نہیں دونوں کو پسند کرتا ہوں اور نہ دونوں کے خلاف ہوں۔ دونوں کے فوائد اور نقصانات برابر کے ہیں۔ ویسے خالص اقتصادی نقطۂ نظر کی رُو سے "مقابلہ" ضرور ہونا چاہیئے۔ اس طرح "عوام" کو فائدہ ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کالج کے "عوام ووٹروں" کی چائے سے زیادہ سے زیادہ تواضع ہو جاتی ہے۔ بلا مقابلہ کی صورت میں "ان عوام" کے وارے نیارے کم ہی ہوتے ہیں۔

(انٹرویو نامکمل — یار زندہ صحبت باقی)

(مرسلہ عبدالستار یزدانی)

وان گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دُعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

———— (غالب)

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

———— (ذوق)

بے زبانی ترجمانِ شوقِ بیحد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہاں

———— (حسرت)

اتفاق ضروری نہیں!!

★ الیکشن :- واحد موقعہ جبکہ امیدوار کا ماضی بے داغ حال پاکیزہ اور مستقبل درخشاں ثابت کیا جاتا ہے۔

★ ووٹ :- انسانی ضمیر کا انگریزی نام ہے۔ آجکل "نوٹ" سے بہت محبت ہو گئی ہے۔

★ دارالاقامہ :- کلیاتی انتخابات کے سلسلہ میں منظم ترین "ووٹرز ایکسچینج مارکیٹ" ثابت ہوا ہے۔

★ کالج ٹک شاپ :- آجکل "ٹکسال" کے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔ "ووٹرز مارکیٹ" کے سکے یہاں ہی تیار ہوتے ہیں۔

★ چائے کی پیالی :- "ٹکسالی سکہ" جس سے الیکشن کے ایام میں امیدوار کی قوتِ خرید اور ووٹر کی "قوتِ فروخت" معلوم کی جاتی ہے۔

★ سلامتی کونسل :- آجکل صرف "محفوظ" اور "طاقتور" ملکوں کے مفاد کی "سلامتی" کی خاطر کام کرتی ہے۔

★ دوستی :- ایک نہایت ہی لطیف احساس جو آجکل "ابن الوقتی" سے برسرِ پیکار ہے۔ بین الاقوامی سیاست کے ہاتھوں سخت نالاں ہے۔

★ احتیاط :- بعض لوگ اسے سوسائٹی کے ساتھ بدظنی قرار دیتے ہیں۔

★ ٹیڈی ازم :- تہذیب جدید کا "زمانہ جاہلیت" اور "جنگلی زندگی" کی طرف ایک ناقبت اندیش قدم ہے۔

★ لاشعور :- زنگارنگ خیالات و جذبات کا ایک پُرسکون مسکن۔ "شعور" کی عدم موجودگی میں اکثر انسانی کردار کی ماتحت نگرانی کرتا ہے۔

محمود اصغر مجاہد

منصور احمد
بی۔ اے سال اول

طنز و مزاح

"ہم نے بھی امتحان دیا!"

امتحانات آئے! چلے گئے! ہم نے نہایت احتیاط کے ساتھ تمام پرچہ ہائے سوالات پر فرسٹ ڈویژن کے نمبر لگائے اور اپنے یار دوستوں کے ساتھ بحالیٔ صحت کے مسئلے پر غور کرنے لگے۔

انہی دنوں اپنے ایک محترم استاد سے جو ملاقات ہوئی تو جناب نے فرمایا۔

"کہئے بھئی پرچے"

میں نے جھٹ جواب دیا "اچھے ہوئے ہیں جناب"! فرمانے لگے "وہ تو علم ہی ہے جیسے ہوئے ہیں۔ یہ بتایئے ہو تو گئے ہیں نا"

مجھے افسوس تو کافی ہوا کیونکہ میری امیدوں کا بنا بنایا محل ایک پل میں اُجاڑ کے رکھ دیا گیا تھا۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ استاد کے سامنے زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ نہایت پریشانی کے عالم میں گھر چلا آیا۔ چند دن بعد اپنے دیس سندھ کی راہ لی۔ وقت گذرتا رہا۔ اور میں اپنے خیالات میں محو سندھ کی جنت نما وادی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ آخر رزلٹ نکلنے کی خبر نے مجھے جھنجھوڑا۔ اور میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے حیدرآباد کی راہ لی۔ وہاں پہنچکر کسی پنجاب کے اخبار کا جو دریافت کیا تو ایک صاحب نے اس مسئلہ کو حل کرنے کا ذمہ لیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اطلاع دی کہ "اخبار کل صبح ہی مل سکے گا"۔ بہت افسوس ہوا لیکن مجبور تھا۔ ایک ہوٹل میں چارپائی لی۔ اس پر لیٹ گیا مگر نیند کہاں کبھی غالب کا کوئی مصرع یاد آتا ع

کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

کبھی نتیجہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مومن کا یہ شعر خواہ مخواہ دردِ زبان بن جاتا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

رات گذری صبح ہوتے ہی باہر نکلا اور سڑک پہ جاتے ہوئے ایک بڈھے کو جا لیا۔

"جناب آپ نے اخبار کا وعدہ کیا تھا"

"کیا کہا"۔ سنتے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کیونکہ خلاف توقع وہ اخبار والے صاحب نہیں تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور بزرگ پہ جو گمان گذرا کافی تیز جا رہے تھے۔ تو ان کے پیچھے ہو لیا۔ کوئی ایک آدھ میل کے فاصلہ پر جوڑ کے تو میں نے فوراً مطالبہ کیا "اب تو کافی وقت ہو گیا ہے۔ میری گاڑی بھی جا رہی ہے اخبار چاہیئے"۔ تو میری حالت کا اندازہ لگائیے۔ جب انہوں نے کہا۔

"میری تو یہاں کوئلوں کی دکان ہے"

وہاں سے چلا تو واپس آکر ایک بڑے ہوٹل کے سامنے اخبار فروش کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ اس اثناء میں

ایک اچھے خاصے شریف آدمی نہایت ہی عمدہ لباس میں ملبوس تیزی سے جاتے ہوئے میرے بکھرے ہوئے ہاتھوں میں ایک پیسہ تھماتے چلدیئے۔ اور میں تقریباً ایک گھنٹہ کھڑا پیسہ پر نظر جمائے ہوئے خدا کی قدرت پہ حیران ہوتا رہا۔

اتنی دیر میں صاحبِ اخبار کا درود بھی ہو چکا تھا پہنچکر اخبار کا جو دریافت کیا۔ تو اخبار والا یوں گویا ہوا۔

"بابے! اخبار نہیں ملا۔"

ایک خیال دل میں آیا۔ وہاں کے ایک سندھی اخبار کے دفتر میں پہنچا۔ ایک کمرہ کے باہر جلی حروف میں لکھا تھا "[illegible]" اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ پھر وہی اخبار کا مطالبہ۔ ان کا میرے سراپا کا جائزہ لینا، میری دھوتی کو دیکھکر گھورنا اور "جی نہیں" کا جواب دینا نہیں اگرچہ بھول چکا ہوں ۔۔۔ مجھے تو آج بھی کل کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ کہیں سے "الفضل" جو ملی تو معلوم ہوا کہ رزلٹ انٹر سائنس کا تھا نہ کہ انٹر آرٹس کا۔ اور یہ خیال کرکے کہ "میں پاگل ہوں" حیدرآباد سے گھر کی راہ لی۔

آخرکار رزلٹ کا نکلنا "نوائے وقت" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کی اشاعتِ خاص میں اپنا رول نمبر نہ پانا۔ گھبرانا۔ بڑوں کا نصیحتیں کرنا۔ بعض کی خوشیاں بعض کے غم۔ چھوٹے بہن بھائیوں کا سارے گاؤں میں شور مچانا "بھائی جان فیل ہو گئے۔ فیل ہو گئے۔ فیل ہو گئے" یعنی کہ خوب تشہیر کرنا۔ سب احباب کے تیور بدلے ہوئے نظر آنا۔ پھر عزیز و اقارب اور آس پاس کے دوسرے بزرگوں کا تشریف لانا۔ چائے پینا اور گلے کے ذرا گرم ہونے پر کچھ یوں گویا ہونا "کوئی بات نہیں ہے ناکامیاں کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ بے کار میں صحت کو خراب نہ کر لینا ۔۔۔" آہ کس قدر تلخ تھے یہ گھونٹ میرے حلق کے لئے۔ چند دن گذرے تو ڈاکیہ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی طرف سے ایک کارڈ لئے میری طرف لپکا۔ بے دلی سے کارڈ پکڑا۔ کہ فیل ہونے کی تائید مزید ہی تو ہے۔ لیکن بتاؤں وہاں کیا لکھا تھا؟

"Mr Mansoor Ahmad
Passes The Inter-Examination"

قدرت حیران تو ہوئی مگر اس وقت جب زبانِ حال سے اقرار کروا چکی کہ مصیبتیں جب آتی ہیں۔ تو جنازہ نکال کر ہی جاتی ہیں!!

زرّیں اقوال

- ہزار لوگوں کی دوستی ایک شخص کی عداوت کے بدلے مت خریدو۔ (سمائلز)
- بعض کو بڑا بنا کر پیدا کیا جاتا ہے۔ بعض "بڑائی" حاصل کرتے ہیں اور بعض پر بڑائی کو ٹھونسا جاتا ہے۔ (شیکسپیئر)
- تمام بڑے لوگوں کی زندگیاں ہمیں یاد کراتی ہیں کہ ہم بھی بڑے بن سکتے ہیں۔ (لانگ فیلو)
- زندگی کی حقیقی چاشنی عزتِ نفس، معرفتِ نفس اور ضبطِ نفس میں ہے۔ (ٹینی سن)
- ہر قسم کا اعزاز اچھے اعمال میں پنہاں ہے۔ (پوپ)
- محبت خود آتی ہے خریدی نہیں جاتی۔ (لانگ فیلو)

(مرسلہ سیّد نصیر احمد)

عابد علی عابدؔ
(ایف - ایس سی رسالہ دوم)

طنز و مزاح

فلاں ابنِ فلاں

ہمیں ان سے کچھ کچھ اُلفت ہو گئی تھی۔ مطلب یہ کہ ہم ان کا احترام واجب سمجھنے لگے تھے۔ خدا جانے ان کو بھی ہم سے لگاؤ تھا یا نہیں۔ ہمیں تو دلوں کے ٹیلیفون پہ پُورا پُورا ایمان ہے۔

آمدم برسرِ مطلب۔ حضرات قارئین! مجھے یہاں ابنِ فلاں کی کوئی بُرائی بیان کرنا تو مقصود نہیں اور نہ ہی ہمارا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ نوجوانانِ قوم کو "ہوشیار باش" کا پیغام پہنچا دیا جائے۔

جناب فلاں اور بندہ مع دو اور ساتھیوں کے ہوسٹل کے ایک کمرہ میں مقیم تھے۔ خوش قسمتی سمجھیے یا بدقسمتی مجھے اس کمرہ میں چند ماہ گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی اس دوران کئی واقعات معرضِ وجود میں آئے جو ہمارے فلاںؔ ابن فلاںؔ کی سیرت پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ساتھ ہی تعوذ "پڑھنے کی تحریص بھی دلاتے ہیں۔

ایک معمول تو صاحب بہادر کا یہ تھا کہ جونہی کوئی دوست ان کے کمرہ میں داخل ہوتا وہ اُسے فوراً زورآزمائی کیلئے بلاتے آغاز گھورنے سے ہوتا۔ بس آنکھوں آنکھوں میں لڑائی شروع ہو جاتی۔ پھر زبان سے اور پھر فلسفہ ارتقاء کی منازل طے کرتے کرتے نوبت دست و پا تک پہنچ جاتی۔ آخر بڑی جد وجہد سے ملاقات کے خواہشمند حضرت اپنی جان چھڑاتے جاتے وقت دل میں تو نہ معلوم کیا کچھ سوچتے اور ان کے تصورات میں کیا کچھ رقص کرتا۔ لیکن زبانِ حال سے یہی کہہ رہے ہوتے کہ ؎

ہم کو ان سے وفا کی ہے امّید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

جناب فلاںؔ میں ایک "فلاں خصلت" یہ تھی کہ صرف اپنے پیٹ پر ہی ہاتھ مارتے تھے۔ تفسیر اس خصلت کی یہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے ایک بہت ہی قریبی دوست تشریف لائے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ انہیں ایک چیز کی ضرورت ہے اور بندہ آپ سے حاصل کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ غالباً "ٹائی والی" کی قسم کی کوئی چیز تھی۔ صاحب بہادر نے پہلے تو چند سخت کلمات سے تواضع کی۔ اور پھر صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ کہ میرے پاس نہیں ہے حالانکہ وہ چیز سامنے پڑی خود ہی اس جواب سے شرمندہ ہو رہی تھی۔ مانگی بھی مستعار اور پھر صرف بیس اور چار چوبیس گھنٹوں کے لئے۔ وہ صاحب جناب فلاںؔ کا یہ نئی نوع کا جواب سُنکر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اور خاموشی سے کھسکتے بنے۔ اتفاق ایسا ہوا۔ کہ دوسرے روز وہی صاحب پھر "درِ دولت" پر آ حاضر ہوئے۔ اب کے صاحب بہادر کو کسی چیز کی ضرورت پیش آ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ لگے ان کی خوشامد کرنے۔ اگر کوئی "مکرّا" یہ گفتار خوش نوا سُن لیتا۔ تو یقیناً اپنے فن میں کمی کا اعتراف کرتا۔ انہوں نے

بڑی سادگی سے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے جواب دیا کہ یہ چیز تو میرے پاس نہیں۔ جناب فلاں کی "جبلتِ خلّاقیہ" بھڑک اٹھی، چونکے، خفا ہوئے اور پھر کہنے لگے " باز آئے ہم ایسے دوستوں سے لطف تو تب تھا کہ اپنے پاس نہ تھی تو کسی ایرے غیرے سے مستعار لا دیتے، یا " فلاں جنرل سٹور" کی خدمات ہی حاصل کر لیتے۔" دیکھی آپ نے ابنِ فلاں کی فلاسفی ؎

خوب ہے تیری نصیحت، خوب ہے تیری نصیحت

واہ رے میاں فضیحت۔ واہ رے میاں فضیحت،

صاحب بہادر کو پڑھائی کی "منصوبہ بندی" کا بھی بہت شوق تھا مگر تھا صرف مشغلے کے طور۔ ایک روز کالج کا کام نہ کرنے پر اچھا خاصہ "وزنی جرمانہ" ہو گیا۔ صاحب بہادر نے رات کے "نصفِ ثانی" میں پڑھنے کی ٹھان لی۔ چند دن تو صرف "ٹھاننے" ہی رہے۔ آخر ایک دن بندۂ پر تقصیر کو جا لیا اور بڑے تامل اور تحمل سے فرمانے لگے "بھئی میرا کافی دنوں سے کام رہ رہا ہے۔ رات کو نیند نہیں چھوڑتی "ٹائم پیس" بھی غداری کر جاتا ہے۔ تم ہی میری مدد کرو۔ جب بارہ بجے اپنا مطالعہ ختم کرو تو مجھے جگا دیا کرو"۔ قوم۔ کرامت ... فرد میں جو آثارِ بیداری دیکھے تو سرِ تسلیم خم کر دیا۔ رات کے بارہ بجے تو صاحب بہادر کو بیدار ہونے کے لئے کہا۔ استفسار کرتے ہوئے فرمانے لگے "کون ہے" میں نے کہا "صاحب اٹھو اور اپنا مطالعہ شروع کرو۔ کام پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ"۔ کہنے لگے "جاؤ جا کے آرام کرو۔ کیا بڑ بڑ لگا رکھی ہے۔ حرام کر دیا ہے آپ لوگوں نے میرے آرام کو"۔ میں ان "کلماتِ تحسین و آفرین" کو بغل میں دبا کر سیدھا اپنی چارپائی پر جا لیٹا۔ صبح ہوئی تو صاحب بہادر پھر ہمارے سر پر سوار "میرا کافی سے زیادہ کام رہ گیا ہے۔ تم نے میرا سخت نقصان کروا دیا ہے۔ میرا بیڑا تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ کیسے خود غرض ہیں یہ لوگ —" یہ تمام فقرات بغیر بریک لگائے کہہ گئے۔ بہتیرا یقین دلایا کہ بھئی ہم نے تو جگایا تھا لیکن جب موصوف کو ہی نیند سے "بیزار" ہو گیا تھا تو ہماری "رقابت" کیا "معجزہ" دکھلا سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنی "گردان" بدستور جاری رکھی۔

اگلی رات پھر حکم صادر ہوا کہ ہم کو جگایا جائے۔ میں نے صاف انکار کر دیا "چونکہ صاحب جاگتے نہیں اس لئے بہتر ہے نہ ہی جگایا جائے"۔ کہنے لگے "نہیں تمہیں جگانا ہو گا۔ ورنہ زور آزمائی . . . ." پھر عذر کیا کس طاقت سے جگائیں۔ کہنے لگے "خدا نے تمہیں ہاتھ کس لئے دیئے ہیں۔ اگر نہ اٹھوں تو ایک عدد تھپڑ رسید کر دو اور جبراً اٹھا دو"۔ ادھر رات کا نصف حصہ گذرا۔ ادھر ہمارے دماغ میں صاحب کو جگانے کا خیال آ دھمکا۔ اور صاحب کے الفاظ بھی یاد آ گئے۔ لرزاں و ترساں صاحب کو ہلایا۔ بس پھر بڑے خفا ہو کر اٹھے، لگے جھگڑنے تو لنے۔ بڑی مشکل سے جان بخشی ہوئی۔ الحمد پڑھتے ہوئے اپنے بستر پر جا لیٹے اور تہیہ کر لیا کہ آئندہ قطعاً نہیں اٹھاؤں گا۔ اس کے بعد ان کے خوب وارے نیارے ہوئے۔

آہستہ آہستہ صاحب بہادر مجھ سے کچھ زیادہ ہی گھل مل گئے۔ یہاں تک کہ جب چاہتے میرا صندوق کھول کر حسبِ منشاء اشیاء نکال لیتے۔ کتاب۔ کاپی۔ پنسل۔ سیاہی۔ ٹائیلٹ وغیرہ۔ ایک دن ہم نے بھی ان کی اس عادت کو اپنانا جائز سمجھتے ہوئے یہ غلطی کی کہ ان کا صندوق کھول کر پین میں سیاہی بھر لی چاہی عین موقع پر صاحب بہادر بھی اپنی آوارہ گردی ختم کر کے کمرہ میں ٭٭

٭٭ آ حاضر ہوئے۔ آ کر دیکھا نہ تاؤ، بندۂ ضعیف پر بل پڑے۔ بہتیری دعا کی "چل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو" مگر حضرت کے تکلے اور زبان تھی کہ بند ہونے کو نہ آتے تھے ۔ تیری خود غرضی پہ قربان! تیری خود غرضی پہ قربان!! ٭ واہ رے ابنِ فلاں! واہ رے ابنِ فلاں!!

عبدالغفور احسان
ایف۔ ایس سی۔ سال دوم

طنز و مزاح

ٹوپی

عالمی اور ملکی مسائل کی حدود سے نکل کر بندہ اس فرصت میں ایک خالصتہً کلیاتی مسئلہ پہ خامہ فرسائی کیا چاہتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے "مسئلہ ٹوپی"۔ صوبہ سرحد والی "ٹوپی" نہیں۔ بلکہ وہ "ٹوپی" جو ہماری اکثر درسگاہوں میں یونیفارم کا ایک حصّہ ہے۔ بڑے بڑے اہم مسائل ہیں مثلاً بڑھتی ہوئی آبادی۔ اصلاحِ طریقِ تعلیم اور تنخواہوں میں اضافہ کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔ مگر صاحب "یہ مسئلہ ٹوپی" بھی کافی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ شاید نفسیاتی اثر ہو گیا ہے ہم تو اسے اس طرح تمام مسائل کے "سر پر" سمجھتے ہیں جس طرح یہ محترمہ ہمارے سروں پہ حکمرانی کرتی ہے۔

درسگاہوں کی قانون ساز مجلسوں نے اب تو اسے اتنے حقوق عطا کر دیئے ہیں کہ "مشہور پرانے استاد مولا بخش" کو بھی مات کر گئی ہے۔ جس کو چاہے جرمانہ کرا دے۔ جس کو چاہے بزرگوں کی نظروں میں گرا دے۔ جس کو چاہے بھری مجلس سے "داک آؤٹ" کروا دے۔ اس قدر اثر تو درسگاہوں تک محدود ہے۔ بیرونِ حدودِ کلّیہ یہ بھی سنا گیا ہے کہ ٹوپی کے بڑھتے ہوئے رواج سے "پگڑی" کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

کئی سال گذرے میں نے ایک اخبار میں پڑھا کہ طلبہ کو جب "ٹوپی" پہننے پر مجبور کیا گیا۔ تو اگلے روز وہ بجائے ٹوپیوں کے "پگڑیاں" پہن کر آ گئے۔ اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ پگڑیوں کا خوف محض سطحی ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ طلبہ کی خواہش پر جلد ہی تمام درسگاہوں میں سال بھر میں ایک دفعہ "ٹرین ڈے" منانا لازمی قرار دے دیا جائے۔ آجکل مطالبات منوانے کا زمانہ ہے۔ پگڑی کے ہمدردوں کو فضا کی سازگاری سے جلد فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

بعض نازک اندازِ خیال رکھنے والے کہتے ہیں کہ ٹوپی خوبصورتی کو کم کرتی ہے۔ اور اس سے شخصیت میں فرق آتا ہے۔ وہ "ننگے سر" رہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں انسان خوبصورتی کا دلدادہ ہے۔ آئینہ میں خوبصورت گھنگریالے بالوں کے مشاہدہ کے بعد کونسی قوتِ ارادی ٹوپی کو سر پہ جما سکتی ہے۔ ٹوپی پہننا تو بڑے باہمت اور پہاڑ اتنی قوتِ ارادی رکھنے والوں کا کام ہے اگرچہ یہ سچ ہے جمالیات کے پرستار "بے بس" ہیں لیکن اس کے باوجود حیران ہوں کہ وہ سر چھپائے بھی رہتے ہیں؟ زندگی میں ان کی ساری تگ و دو سر چھپانے کے لئے ہے۔ کوئی سر چھپانے کے لئے جھونپڑی بنا لیتا ہے۔ کسی نے محل بنا لئے۔ مگر کوئی بڑے ہی پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ جنہوں نے ٹوپی ایجاد کی۔ اور ہم فی الحقیقت سر چھپانے کے قابل بن گئے۔ جب میں ٹوپی پہنے ہوئے ہوتا ہوں۔ مجھے "میرا سر محفوظ ہے" کا احساس ہوتا ہے۔ ٹوپی ان خیالات اور چیزوں کو جو ہم بڑی تندہی اور محنت کے بعد عقل و دماغ میں داخل کرتے ہیں۔ سر کی

برہنہ سطح سے بخارات کی صورت میں اڑنے نہیں دیتی۔

ٹوپی پسند نہ کرنے والے اسے ایک بوجھ سمجھتے ہیں۔ اگر آج وہ اپنے سروں پر ٹوپی جیسی ہلکی چیز کا بار اٹھانے سے ڈرتے ہیں تو کل وہ ملک و قوم کا بوجھ کیسے اٹھائیں گے؟ ٹوپی ہماری جرأت اور قوت برداشت کی آئینہ دار ہے ہندوستانی جس سے بھی نبرد آزما ہوں گے۔ منہ کی کھائیں گے کیونکہ ان کی ہلکی ٹوپیوں سے ہی یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس سے یہ فلسفہ نکلا کہ Heavier The cap, greater the advantage

معلوم ہوا ہے حال کی سائنسی تحقیقات نے بھی ٹوپی کے فطری طور پر مفید ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ ٹوپی بہت سے جوہر محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے۔ مثلاً علم نباتات پڑھنے والے بخوبی جانتے ہیں اگر روٹ (Root) پر کیپ نہ ہو تو وہ بڑھ نہیں سکتی اور جل سڑ جاتی ہے اسی طرح انسانی روٹ یعنی خیالات کے مرکز "سر" پر بھی ٹوپی ہونی چاہیئے۔ تاخیالات آوارگی کے زیر اثر پراگندہ نہ ہو جائیں۔ مشہور ہے۔ "ننگے سر ہونا آوارگی کی علامت ہے"

حال ہی میں ٹوپی نے پاکستانی معیشت پر اچھا اثر ڈالا ہے۔ جیکولین کینیڈی کو جو ٹوپی پسند آئی تو دوسری امریکی عورتیں بھی اس پر لٹو ہو گئیں۔ چنانچہ انہوں نے مہنگے داموں دو بڑے بڑے بحری جہاز ٹوپیوں سے لدے ہوئے منگوائے۔ چنانچہ پاکستان میں اس قسم کی ٹوپیوں کی قیمت بوجہ زیادتِ طلب بڑھ گئی ہے۔ ٹوپی کے جواز کے عجیب عجیب دلائل خود ہی خود تیار ہو رہے ہیں۔ اب مجھے کوئی "پرستار جمالیات" بتائے کہ کیا امریکی خاتون جمالیات کی اس سے کم دلدادہ ہے نہیں ہرگز نہیں۔ پس سوچئے کہ کیا یہ ننگے سر رہنے کی مغربی اقوام کی نقل تو نہیں جو ہمیں جمالیات کی دلیل دینے پر مجبور کرتی ہے۔ خدا نہ کرے۔ مغرب کی نقل میں ہماری عورتیں ٹوپی پہننی شروع کر دیں اور مرد رِبن باندھنا۔ کیونکہ آجکل "عقل" تو کم لوگ ہی استعمال کرتے ہیں جدھر دیکھتا ہوں "نقل" کا بت ہے جس کے سامنے لوگ سجدہ ریز ہیں۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ۔

غور کرنے والے کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔ ایک دن میں نے ٹوپی کی سطح پر غور کرنا شروع کیا۔ میں نے اس پر نشیب و فراز دیکھے۔ دیکھتے ہی اچھل پڑا "بہت خوب! میری ٹوپی تو مجھے بتانا چاہتی ہے کہ زندگی نشیب و فراز کا مجموعہ ہے۔" پھر میں نے ایک اور پہلو سے اسے دیکھا وہ مجھے گول نظر آئی۔ میں پھر اچھل پڑا۔ "شکریہ محترمہ! تو تو مجھے یہ بتانا چاہتی ہے کہ زمین گول ہے۔" ایک ظریف طبع مفکر نے نہ معلوم کس پہلو سے ٹوپی پر نظر ڈالی کہ کہنے لگا "واللہ! نئی وضع کا کشکول ہے۔"

بقیہ اداریہ:۔ اُسے عام عبادت گذار سے زیادہ خیر و برکت ملتا ہے۔

پس غور کیجیئے وہ شخص جوان تمام امور کا پابند رہتا ہے وہ کس قدر سخت امتحان سے گذرتا ہے۔ بلاشک خدا کی ذات کے علاوہ اور کوئی اجر اس کی قربانی کے برابر نہیں ہو سکتا۔

بالآخر دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رضا و خوشنودی کی راہوں پر چلائے اور ہم میں سے ہر ایک کو اس امتحان میں کامیاب کرے تا اس امتحان کے اختتام پر جب ہم اپنے اندر گناہ کے خلاف بے پناہ عملی اور دفاعی قوت پائیں تو عید کی خوشیوں سے پوری طرح محظوظ ہو سکیں۔ وباللہ التوفیق۔

افسانہ

بو: رحمت اللہ طاہر
بی۔ اے۔ سال سوم (آنرز)

دوست آں باشد۔۔۔!

اتنی رات گئے دروازے پر دستک کی آواز سُنکر عابد اٹھا اور بدحواسی کے عالم میں صحن کے دروازے کی طرف لپکا۔ کون ہے؟ آواز آئی "بیٹے میں ہوں قسمت کی ماری اور بدنصیب بڑھیا۔ جسے رات کو سونا بھی میسّر نہیں"۔

"اچھا! تو مطلب یہ ہے کہ صابر آج بھی گھر نہیں آیا"۔ عابد بولا۔ "ہاں بیٹے۔ نہ جانے وہ اس وقت کہاں ہوگا۔ کیا کر رہا ہوگا؟ کس حال میں ہوگا؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں اس پر بربادی کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ وہ کیوں نہیں سمجھتا۔ دنیا کے کام کاج کرنے سے میری طاقت جواب دے چکی ہے۔ اب تو صرف م۔۔۔۔م۔۔۔۔موت کی کسر باقی ہے۔ وہ بھی پوری ہو جائے گی"۔

یہ الفاظ سُنکر عابد کا دل بھر آیا۔ دل میں سوچنے لگا۔ یہ وہی صابر ہے جس کو ہم اس کی شرافت اور سادگی کی بناء پر "صوفی" کہا کرتے تھے۔ یہ وہی صابر ہے جو پنجوقتہ باجماعت نماز کا عادی تھا۔ سارا دن محنت کرتا یا پھر ماں کی خدمت میں مصروف رہتا۔

صابر کے ابا جان وفات پا چکے تھے۔ اس کی ماں کی زندگی کا سب سے بڑا آسرا اور سہارا صابر کا ہی وجود تھا۔ اور اس کی نیکی اور سعادت کے باعث سبھی اس کو چاہتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے علاوہ دیگر اسلامی احکامات کی پیروی بھی پورے وثوق اور یقین سے کرتا تھا اسکی زندگی حقیقی طور پر ایک مومن کی زندگی تھی۔ مگر قابلِ رشک اخلاق کا حامل صابر آج بدل چکا تھا۔ عیاشی اس کا پیشہ اور آوارگی اس کا مشغلہ بن چکی تھی۔ اکثر وقت اپنے آوارہ اور بدمعاش دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکتے میں گذارتا۔ صوفی کی بجائے لوگ اب اسے بدمعاش سمجھتے تھے۔

جب کبھی عابد اپنے دوست کے حالاتِ حاضرہ پر غور کرتا تو اُسے سخت افسوس ہوتا۔ اس کا دل بیٹھنے لگتا اور اس پر انسان کی کمزوری اور کم عقلی ظاہر ہوجاتی اس نے بہتیری کوشش کی کہ صابر ان بُری عادتوں کو چھوڑ دے اور اصلیت کی طرف لوٹ آئے۔ مگر اس کی طبیعت کی ضد۔ آوارہ دوستوں کی صحبت اور گندے معاشرہ نے اس کے دماغ میں سوچنے کی اہلیت ہی نہ چھوڑی تھی۔

جب بھی کبھی عابد صابر کے ساتھ گفتگو کرنے کی کوشش کرتا۔ تو اس کے نئے اور آوارہ دوست جن کی شکلیں شیطان کی صورت کو واضح کر رہی تھیں۔ صابر کو بازو سے کھینچتے ہوئے ایک طرف لے جاتے اور کہتے چھوڑو یار! اس مسجد کے مینڈک کے پاس کیا ہے یہ تو وہی پُرانی بولی بولے گا۔ اس کو کیا علم زندگی کیا ہوتی ہے بس نمازوں پر ہی زور ہے۔ اور سوکھ سوکھ کر لکڑی ہو رہا ہے تھوڑی دیر بعد دِتو بولا۔ چلو مولوی جی آپ کو جگا نکشری بتلائیں"

لے چلیں۔ پھر صابر کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ "چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے۔ چلو یار چلیں۔ اپن کا انتظار ہو رہا ہوگا۔"

ان الفاظ کو سن کر عابد کے دل پر ایک بجلی سی گری اور اس کے جسم کا ہر بال کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ دتو کی زبان پکڑ کر کھینچ لے۔ مگر اس نے چپ ہی بھلی سمجھی۔ اور منہ پہ انگلی رکھے ہوئے کبھی وہ گھر کی طرف دیکھتا اور کبھی دتو کی طرف۔ اسی گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں وہ استغفار پڑھتا ہوا گھر پہنچا۔

پہلے تو صابر ایک لفظ بھی عابد کے خلاف سن نہ سکتا تھا اور جو کوئی بھی اس کے خلاف بات کرتا تو غصے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں۔ لیکن اب وہ اپنے نئے دوستوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگ گیا تھا۔ اس لئے عابد کی عزت اور دوستی وغیرہ کی بالکل پرواہ نہ کرتا۔ بلکہ خود بھی اس کے متعلق عجیب واقعات ان کو سناتا۔ اور حیرانگی کا اظہار کرتا۔ کہ "عابد کو زندگی کی لذتوں کا علم نہیں۔ وہ بیوقوف ہے۔ بچہ ہے۔" اکثر دفعہ عابد نے کوشش کی کہ صابر اس بری صحبت سے باز آجائے۔ مگر صابر کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اور وہ اپنی غلطیوں اور آوارگیوں میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔

صابر کو اپنے پرائے کی کوئی پہچان نہ تھی وہ اب بہت بڑا بدمعاش اور گاؤں کے لئے ایک مصیبت بن چکا تھا۔ عابد کے ذہن میں صابر کے کردار کو درست کرنے کی کوئی بھی ترکیب نہ آتی تھی صرف اسی یقین پر جی رہا تھا کہ خدا تعالےٰ کے کاموں میں دیر ہے اندھیر نہیں اور صابر ضرور ایک دن اصلیت کی طرف لوٹے گا۔

★ ★ ★

خشو، منشا، گاموں، دتو، چھوا اور شیرا جگا ہوٹل میں بیٹھے صابر کا بڑی بیتابی سے انتظار کر رہے تھے۔ دتو بولا "آخر صابر کے اب تک نہ آنے کی وجہ ہمیں ملاں عابد کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔" "کیوں نہ اس کا معاملہ ہی صاف کر دیں آئے دن ہمارے کام میں رخنہ اندازیاں کرتا رہتا ہے۔" گاموں بولا۔ خشو اپنی آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔ "نہ بھئی صابر کے دل میں اب بھی عابد کی محبت ہے اور اگر کسی نے ایسا ویسا کوئی فعل کیا تو یاد رکھو ہماری خیر نہیں سب کو ہی باری باری لے گا۔" صابر کی آمد کے ساتھ ہی یہ گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

★ ★ ★

صابر کی ماں عشاء کی نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی ہدایت کے لئے بہت دعائیں کرتی رہتی تھی۔ کہ اے مولا کریم! مجھے صابر سے کوئی خواہش نہیں کہ وہ میری خدمت کرے۔ میری عمر تو کافی سے زیادہ کٹ گئی ہے اور جو باقی ہے وہ بھی کٹ جائے گی لیکن میری دلی آرزو ضرور ہے کہ تو اس کو اپنی رحمتوں اور فضلوں سے نواز اور اس کو ہدایت دے۔ محمدؐ کی محبت سے بچا اسلام کا سچا سپاہی اور ملک کا خادم بنا۔

اے خدائے قدوس! میرا سینہ جل گیا ہے میری روح جھلس گئی ہے۔ میرا جینا حرام ہو گیا ہے میں ایک زندہ لاش ہوں اور صابر کے غم میں پاگل ہو گئی ہوں۔ تو ہی سمیع و علیم ہے پس میری دعاؤں کو سن اور استجابت بخش!

گھڑیال نے رات کا ایک بجایا۔ ہُو کا عالم تھا۔ صابر اپنی پارٹی کے ہمراہ گاؤں سے چودہ میل دور ۔۔۔ دریا کے

اس بار — ضلع کے سب سے بڑے جاگیردار کے مکان کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ صابر ہر ایک کو اس کی جگہ بتاتا اور بار بار تاکید کرتا کہ خواہ کچھ ہو جائے جب تک میں سیٹی نہ بجاؤں مقابلہ کرنا اور اپنی جگہوں پر ڈٹے رہنا۔

★ ★ ★

صابر کی ماں عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مصلیٰ پہ ہی پڑ گئی تھی۔ آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ کسی سفید اونچی چٹان پر کھڑی ہے جس کی بلندی بہت زیادہ ہے۔ اور زمین پر ایک سیاہ اور خطرناک دھواں سا برپا ہے۔ لوگ افراتفری کے عالم میں شور مچاتے ہوئے دوڑ رہے ہیں۔ اتنے میں اس کو صابر انہی بادلوں کو چیرتا ہوا بھاگتا جاتا دکھائی دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ آوازیں بھی آتی ہیں۔ "پولیس — قتل — ڈاکہ — بھاگو — دوڑو — پکڑو —"

اس منظر کو دیکھ کر بڑھیا کا دل بیٹھ گیا اور وہ اندھا دھند چٹان سے اتر کر صابر کی طرف بھاگنے لگی۔ میرا صابر — میرا لال — میں پولیس — نہیں — نہیں — وہ ایسا نہیں ہے — وہ بے گناہ ہے — بے قصور ہے —" "ہٹ جاؤ" تھانیدار نے گرجتے ہوئے کہا۔ "یہ پاگل پن کسی اور کو دکھاؤ۔ خونی اور قاتل، بھاگنے سے پہلے تجھے کیوں کر مل جائے۔" بڑھیا نے آگے بڑھ کر تڑاق سے ایک چپت تھانیدار کے منہ پر رسید کیا اور فوراً صابر کے ساتھ چمٹ کر رونے لگی —

"دیکھتے کیا ہو۔ اس بڑھیا کو اٹھا کر سڑک پر پھینک دو" تھانیدار کڑکتے ہوئے بولا۔ جونہی سپاہی نے بڑھیا کو بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ تو بڑھیا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی صابر کی چارپائی کی طرف بڑھی اور پاگلوں کی طرح بستر کی چادر، تکیہ کا غلاف اور لحاف اٹھا اٹھا کر وہاں صابر کو دیکھنے لگی۔

★ ★ ★

عابد زمین کا مالیہ ادا کرنے کے لئے آج جاگیردار کے ہاں فروکش تھا۔ مگر طبیعت نہ جانے کیوں اتنی اداس اور بے چین تھی کافی رات گئے بھی اسکو بار بار صابر کا خیال آ رہا تھا۔ مجبوراً وہ ٹارچ سنبھالتے ہوئے حویلی سے باہر چلا آیا۔ تھوڑا چلا تھا کہ اندھیرے میں چند سائے رینگتے ہوئے نظر آئے اس نے ان کی آواز محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اور پھر ٹھاں ٹھاں گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اتنے میں لوگوں کا شور و غل اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی — دوڑو — بھاگو — وہ گیا — ڈاکہ — خون —" عابد اپنی پوری قوت کے ساتھ جاگیردار کی حویلی کی طرف بھاگ رہا تھا حویلی سے کچھ دور اسے ایک بھاگنے والے کی آواز سنائی دی۔ عابد وہیں کھڑا ہو گیا اور جب وہ بھاگنے والا قریب آیا۔ تو اس نے ایکدم اس کے منہ پر ٹارچ ماری۔ "ت.... ت.... تم.... ص.... ص.... صابر.... ڈاکہ.... چوری...." اس کا رنگ فق ہو گیا۔ قریب تھا کہ صابر وہاں سے بھاگ جاتا لیکن عابد نے جرأت کر کے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور اسے ساتھ چلنے کو کہا۔ آج صابر کی کیفیت کچھ ایسی ہو چکی تھی کہ عابد کے آہنی شکنجے سے چھٹکارا تو ممکن نظر آ رہا تھا اور نہ اس کی خواہش ہی تھی۔ عابد اسے لیکر حویلی کے اندر داخل ہوا۔ اور اپنے بستر پر سونے کے لئے اشارہ کیا۔ صابر نے تعمیل کی۔

عابد کہنے لگا میں ذرا اندر سے ہو آؤں۔ تم آرام سے پڑے رہو۔ صابر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگر وہ چاہتا تو فرار کا خوب موقعہ تھا۔ مگر آج تو اس کے ضمیر اور روح نے اس کو بھاگنے کی طاقت بھی نہ دی۔

عابد مکان کی ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ اور آواز دی "چوہدری صاحب ــــ اندر سے بہت سے لوگ نکل پڑے۔ "کوئی نقصان وغیرہ تو نہیں ہوا۔ آخر یہ کس کی جرأت ہے کہ ہندو کے گھر پر ڈاکہ مارے۔" یہ معلوم کر کے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا عابد شکر اخدا تعالیٰ کے حضور سجدے میں گر پڑا۔

ادھر صابر کے دماغ میں اس کی گذشتہ نیک اور پارسا زندگی کا تصور عود کر آیا۔ کہ اس کی زندگی کتنی سادہ تھی کس طرح سے لوگ اسکی عزت کرتے تھے۔ اور کس طرح سے اس نے برے دوستوں کی صحبت کے نتیجہ میں اپنی آبرو اور عزت خاک میں ملا دی۔ عابد کی ہمدردی اور محبت کا جذبہ دوبارہ اس کے سینے میں جوش مارنے لگا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ فوراً عابد کے پاس پہنچے۔ یہ خیال آتے ہی وہ چارپائی سے اتر کر باہر حویلی میں اسے ڈھونڈنے لگا۔ تو ایک کونے سے کسی کے رونے اور گڑگڑانے کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً ادھر کو دوڑا دیکھا تو عابد خدا کے حضور سجدہ ریز تھا۔

"اے آقا! تو ہی اس کو سمجھ دے ــــ ہدایت اور نور کے چشمے سے اس کے سیاہ دل کو منور کر دے۔" ان الفاظ کو سنکر صابر کا دل بھر آیا۔ وہ بھی عابد سے چمٹ کر رونے لگا۔ عابد نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں ہے سب کچھ ٹھیک ہے ...... صبح کا بھولا اگر رات کو گھر آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے ــــ" ❖

ــــ (بقیہ آپ کے خطوط) ــــ

المنار میں علمی نوعیت کے مضامین بہت کم ہوتے ہیں بلکہ ہوتے ہی نہیں۔ یہ بھی بہت افسوسناک ہے۔ میرے خیال میں علمی مضامین لکھنے کی زیادہ تر ذمہ داری ہمارے اساتذہ کرام پر ہے یہ اسلئے کہ وہ اپنے اپنے دائرہ میں اپنے علم کا زیادہ وسیع اور گہرا مطالعہ رکھتے ہیں وہ کسی نظریہ کی تردید یا تائید میں زیادہ وزنی رائے دے سکتے ہیں بہ نسبت ایک عام طالب علم۔ تقریباً ہر علم میں ایسے مسائل موجود ہیں جن کے حق میں یا انکی تردید میں اساتذہ کرام ٹھوس تحقیقی مضامین لکھ سکتے ہیں۔ نفسیات میں ایسے مسائل موجود ہیں۔ سیاسیات میں ایسے مسائل موجود ہیں اقتصادیات ایسے مسائل سے بھری پڑی ہیں سائنسی علوم از قسم طبیعیات، کیمسٹری، بیالوجی وغیرہ میں متنازعہ فیہ مسائل موجود ہیں اساتذہ اپنے تجربات سے نئی اور مفید باتیں پیش کر سکتے ہیں یہ تو علوم کی بات ہوئی زبانوں میں بھی ایسے مسائل موجود ہیں جنکے متعلق آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے ہمارے اساتذہ اور طلبہ کو بلاخوف تنقید اپنی ذاتی ریسرچ یا ذاتی نظریہ سے المنار کے کالموں کے ذریعہ دوسروں کو آگاہ کرتے رہنا چاہیئے۔ آخر وہ کونسا بڑا مفکر یا سائنسدان گزرا ہے جس کی ریسرچ اور نظریات کو چیلنج نہیں کیا گیا اگر یہ جمود ٹوٹ جائے تو مجھے یقین ہے ہمارا کالج بھی بہترین مفکر اور سائنسدان پیدا کر سکتا ہے۔

دوسرے کالجز کے رسالوں میں یہ چیز بھی دیکھی گئی ہے کہ اولڈ بوائز کے مضامین ان میں آتے رہتے ہیں المنار میں شاذ ہی کسی اولڈ بوائے کا مضمون آتا ہے۔ اگر اولڈ بوائز اپنے رسالہ المنار کو بھول چکے ہیں تو یہ بہت افسوسناک بات ہے۔ ادارہ کو بھی اس ضمن میں سعی کر کے اولڈ بوائز کو رسالہ کے حقوق سے آگاہ کرنا چاہیئے۔

(باقی دیکھیں ص۔۔ پر)

ارشد ترمذی

تعارف

کالج کے سابق طلبہ کا موجودہ طلبہ سے تعارف کرانے کیلئے المنار میں اس مستقل کالم کا اجراء کیا گیا ہے۔ ہر شمارہ میں سابق طلبہ کا مختصر تعارف شائع کیا جاتا رہیگا۔ اس کالم کا آغاز دو جوان سال صالح سابق طالب علموں کے تعارف سے کیا جا رہا ہے۔ جو تکمیل تعلیم کے بعد اپنی زندگیاں وقف کر کے اسی کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں (ادارہ)

پروفیسر چوہدری ظفر احمد صاحب۔

آپ نہایت مستعد اور محنتی نوجوان ہیں، مذہبی رُوح خوب پائی ہے چنانچہ آپ نے اس وقت اپنی زندگی خدمتِ سلسلہ کیلئے وقف کی جبکہ آپ چھٹی جماعت کے طالبعلم تھے۔ میٹرک کے بعد حسب ارشاد حضرت امام جماعت احمدیہ اطال اللہ بقاءہ تعلیم الاسلام کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ آپ کو اس درسگاہ کی خشتِ اوّل میں سے ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ کالج کے پہلے طالب علم ہیں جنہوں نے بی۔ اے آنرز میں امتحان پاس کیا۔ آپ نہایت قابل اور ذہین ہیں دوران تعلیم ہمیشہ اپنی کلاس میں اوّل آتے رہے۔ ۵۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی سند حاصل کر کے اس کالج میں اقتصادیات کے لیکچرار تعینات ہوئے اس وقت آپ اس شعبہ کے صدر ہیں۔

دورِ طالبعلمی میں کلیاتی سیاست سے کنارہ کش رہے آپ کی انتظامی صلاحیتیں اس وقت اُجاگر ہوئیں جب آپ کا تقرر بطور استاد ہوا۔ مجلس اقتصادیات کے نگران اور ریڈ منٹن کلب کے صدر کے علاوہ گذشتہ تین سال سے آپ سٹاف کونسل کے سیکرٹری کے فرائض بھی سرانجام دے رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ کالج یونین آپ کی انتظامی خدمات کی ہمیشہ رہینِ منّت رہے گی۔ آپ ادارہ المنار سے بھی مکمل تعاون کرتے ہیں اور اکثر اپنے طلبہ سے المنار کے لئے مضمون لکھواتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے عنقریب بیرون ملک تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ کالج کے سب سے پہلے سابق طالبعلم ہونگے جو بیرونی سند حاصل کر کے اس کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیں گے۔

پروفیسر چوہدری حمید احمد صاحب۔

آپ ایک جواں سال اور جواں ہمت استاد ہیں۔ جو کالج کی علمی ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں میں نہایت دلچسپی سے حصّہ لے رہے ہیں۔ طلبہ میں بہت ہر دلعزیز ہیں۔ آپ طالبعلمی کے زمانہ میں بھی کالج کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ دورانِ تعلیم آپ المنار کے حصّہ انگریزی کے مدیر رہے علاوہ ازیں مجلس ریاضی کے صدر اور سائنس سوسائٹی کے نائب صدر رہے آپ نے اس کالج میں ۵۲ء میں داخلہ لیا اور ۵۶ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ اسکے بعد ۵۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ اور کالج میں بطور لیکچرار انگریزی تعینات ہوئے۔ انتظامی معاملات میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس وقت آپ کالج کی روئنگ کلب کے صدر اور المنار (حصّہ انگریزی) کے نگران ہیں۔ حال ہی میں تعلیم الاسلام کے اولڈ بوائز کی جو ایسوسی ایشن بنی ہے۔ آپ اسکے کنوینر بھی ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی خدمتِ سلسلہ کیلئے وقف کر رکھی ہے۔ اور ربوہ حرم کی چار دیواری میں قوم کے نونہالوں کی تدریس کے فرائض نہایت سنجیدگی اور خوش اسلوبی سے ادا کر رہے ہیں۔

ارشد نوشہروی

کالج کے شب و روز

خوش آمدید

عرصہ زیر رپورٹ میں کالج سٹاف میں درج ذیل اراکین کا اضافہ ہوا ہے۔

صاحبزادہ مرزا انس احمد صاحب (شعبہ فلسفہ و نفسیات) چوہدری عزیز احمد صاحب طاہر (شعبہ اقتصادیات)، انور حسن صاحب رضا (شعبہ دینیات و اسلامیات)، سجاد امام صاحب (شعبہ اردو و فارسی) عبدالرشید صاحب غوری (شعبہ تاریخ)، چوہدری محمد سرور صاحب رضا (شعبہ سیاسیات)، ایم کیل۔ ای۔ ولیمز (شعبہ طبیعیات)، مقبول احمد صاحب (شعبہ حیاتیات)، نذیر احمد صاحب (شعبہ تاریخ) اور محمد اسلم صاحب صابر (شعبہ عربی)[1] ادارۂ المنار ان سب اساتذہ کرام کو خوش آمدید کہتا ہے۔

تعمیر

بڑھتی ہوئی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر کافی عرصہ سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ایک نئی اور وسیع تر عمارت تعمیر کی جائے جس کے لئے نقشہ جات عرصہ ہوا تیار ہو چکے تھے اور تعمیر کا کام بھی آغاز پذیر ہو چکا تھا۔ اب جبکہ عنقریب کالج میں ایم۔اے اور ایم ایس سی کی تدریس بھی شروع ہونے والی ہے نئی عمارت کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس کی جانے لگی ہے چنانچہ تعمیر کے کام کو تیز تر اور مؤثر تر بنانے کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں اس بارہ میں جلد وجہد کی تفصیل اور تعمیر شدہ عمارت کی تصاویر المنار کے آئندہ شمارہ میں پیش کی جائیں گی۔ انشاء اللہ۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن

تعلیم الاسلام کالج اپنی زندگی کی انیس منازل طے کر چکا ہے اور ہر لمحہ اس کا قدم ترقی کی طرف بڑھا ہے۔ اس عرصہ میں ہزاروں تشنہ روحیں اس چشمۂ زلال سے فیضیاب ہو کر اطراف و جوانب میں پھیل چکی ہیں اپنی مادر درسگاہ سے کس کو محبت نہیں ہوتی۔ اور پھر درسگاہ بھی تعلیم الاسلام کالج جیسی۔ اسلئے ضرورت محسوس کی گئی کہ ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا جائے۔ چنانچہ اس احساس کے تحت اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لایا گیا ہے ادارہ اس مجلس کا خیر مقدم کرتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ یہ ایسوسی ایشن اولڈ بوائز کا کالج سے تعلق قائم رکھنے کیلئے شاندار نتائج کی حامل ہوگی۔ چوہدری حمید احمد صاحب ایم۔اے اس مجلس کے کنوینر ہیں۔

داخلے

دسمبر ٹسٹ کے بعد طلبہ امید و بیم کے جذبات کے ساتھ داخلوں کی ترسیل کا انتظار کرتے ہیں اس عرصہ میں گیارھویں اور بارھویں جماعت کے داخلوں کی ترسیل کا اعلان کر دیا گیا ہے ان جماعتوں کے طلبہ کے داخلے بھیج دیئے گئے ہیں البتہ چند ایک ایسے طلبہ جنکی تعلیمی حالت قدرے کمزور تھی کے داخلے سپلیمنٹری امتحان کیلئے بھیجے گئے ہیں تاکہ ان کو امتحان کی تیاری کا مزید موقع مل جائے۔

علمی و ادبی سرگرمیاں

عرصہ زیر رپورٹ میں کالج کی مختلف علمی و ادبی مجالس کی کارگذاری درج ذیل ہے:۔

۱ ۲۰ نومبر کو محترم صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب نے

---

[1] امسال سے عربی میں ایم۔اے کی تعلیم و تدریس شروع ہو چکی ہے۔

طلبہ کی ذمہ داریوں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

۲۱ نومبر کو ایک انگریزی مباحثہ بعنوان "Godliness and piety can only be found among the poor" ہوا۔ شہود احمد، مبارک احمد، اور رشید احمد جاوید بالترتیب اوّل دوم اور سوم رہے۔

۲۲ نومبر کو اردو مباحثہ بعنوان "دنیا کی رہنمائی صرف شاعر اور ادیب ہی کر سکتے ہیں" منعقد ہوا۔ جس میں کریم قمر اوّل اور جاوید حسن دوم آئے۔

۵ دسمبر کو ایک آل ربوہ انعامی اردو مباحثہ بعنوان "توہین زندگی ہے بہاروں کی زندگی" منعقد ہوا تعلیم الاسلام ہائی سکول کے پرویز طارق اور مرزا فرید احمد اول اور سوم آئے عطاء المجیب راشد تعلیم الاسلام کالج دوم رہے۔ اگلے روز ۶ دسمبر کو آل ربوہ انعامی انگریزی مباحثہ بعنوان "There should be a change in the foreign policy of Pakistan" منعقد ہوا۔ جامعہ احمدیہ کے یوسف عثمان اوّل، تعلیم الاسلام کالج کے نور محمد چانڈیہ دوم اور برکت اللہ طاہر سوم آئے۔

۱۵ جنوری ۱۹۶۳ء کو امریکی شعبہ اطلاعات لاہور کے آفیسر برائے ثقافتی امور پروفیسر ڈاکٹر ولیم۔ سی۔ کرک نے "امریکی طالبعلم کی زندگی" کے موضوع پر طلبہ سے خطاب کیا۔

کل پاکستان بین الکلیاتی مباحثات میں شرکت

عرصہ زیر رپورٹ میں کالج کے مقررین نے گورنمنٹ کالج کوئٹہ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد، ایمرسن کالج ملتان۔ ویسٹ پاکستان میڈیکل سکول بہاولپور، نشتر میڈیکل کالج ملتان اور گورنمنٹ کالج منٹگمری کے کل پاکستان بین الکلیاتی اردو و انگریزی مباحثات اور مشاعروں میں شرکت کی۔

ٹرافی:۔ کالج کے مقررین نے نشتر میڈیکل کالج ملتان کے کل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی مباحثہ کی ٹرافی جیتی۔ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد اور میڈیکل سکول بہاولپور کے انگریزی مباحثات میں ہماری ٹیمیں دوسرے نمبر پر آئیں۔

انفرادی انعامات (۱) نور محمد چانڈیہ نے گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے مباحثہ میں تیسرا۔ اور بہاولپور میڈیکل سکول اور نشتر میڈیکل کالج ملتان کے مباحثات میں اوّل انعام حاصل کیا۔

(۲) سید شہود احمد شاہ نشتر میڈیکل کالج ملتان کے انگریزی مباحثہ میں دوسرا انعام حاصل کیا۔

مجلس ارشاد

محترم سید کمال یوسف صاحب مبلغ سکنڈے نیویا نے "سکنڈے نیویا میں اسلام" کے موضوع پر تقریر کی۔

مجلس ارشاد کے معتمد چوہدری رشید احمد جاوید نے مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے مقالہ نویسی کے کل پاکستان مقابلہ میں بہترین مقالہ لکھکر اوّل انعام حاصل کیا۔ آپ نے "اسلام اور امن عالم" کے موضوع پر مقالہ لکھا۔

سویڈن سے ہمارے مسلم بھائی جناب سیف الاسلام محمود صاحب نے طلبہ سے خطاب کیا۔ آپ نے اپنے قبول اسلام کے ایمان افروز حالات بیان کئے۔

مجلس اقتصادیات:۔ محترم صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب نے "معاشی مسائل" کے موضوع پر طلبہ سے خطاب فرمایا۔

مجلس تاریخ:۔ پروفیسر حمید الدین صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات گورنمنٹ کالج لاہور نے "۱۸۵۷ء کی اہمیت" پر لیکچر دیا۔

مجلس فلسفہ و نفسیات:۔ محترم صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب

(باقی دیکھیں صفحہ پر)

طلبہ کی ذمہ داریوں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

○ ۲۱ نومبر کو ایک انگریزی مباحثہ بعنوان "Nobility and piety can only be found among the poor" ہوا۔ مشہود احمد، مبارک احمد اور رشید احمد جاوید بالترتیب اوّل دوم اور سوم رہے۔

○ ۲۲ نومبر کو اردو مباحثہ بعنوان "دنیا کی رہنمائی صرف شاعر اور ادیب ہی کر سکتے ہیں" منعقد ہوا۔ جس میں کریم قمر اوّل اور رجا و ید حسن دوم آئے۔

○ ۵ دسمبر کو ایک آل ربوہ انعامی اردو مباحثہ بعنوان "توہین زندگی ہے سہاروں کی زندگی" منعقد ہوا۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول کے پرویز طارق اور مرزا فرید احمد اول اور سوم آئے عطاء المجیب راشد تعلیم الاسلام کالج دوم رہے۔ اگلے روز ۶ دسمبر کو آل ربوہ انعامی انگریزی مباحثہ بعنوان "There should be a change in the forgien policy of Pakistan" منعقد ہوا۔ جامعہ احمدیہ کے یوسف عثمان اوّل، تعلیم الاسلام کالج کے نور محمد چانڈیہ دوم اور برکت اللہ طاہر سوم آئے۔

○ ۱۵ جنوری ۱۹۶۳ء کو امریکی شعبۂ اطلاعات لاہور کے آفیسر برائے ثقافتی امور پروفیسر ڈاکٹر ولیم سی۔ کرک نے "امریکی طالبعلم کی زندگی" کے موضوع پر طلبہ سے خطاب کیا۔

کل پاکستان بین الکلیاتی مباحثات میں شرکت

عرصہ زیر رپورٹ میں کالج کے مقررین نے گورنمنٹ کالج کوئٹہ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد، ایمرسن کالج ملتان۔ ویسٹ پاکستان میڈیکل سکول بہاولپور، نشتر میڈیکل کالج ملتان اور گورنمنٹ کالج منٹگمری کے کل پاکستان بین الکلیاتی اردو و انگریزی مباحثات اور مشاعروں میں شرکت کی۔

ٹرافی:۔ کالج کے مقررین نے نشتر میڈیکل کالج ملتان کے کل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی مباحثہ کی ٹرافی جیتی۔ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد اور میڈیکل سکول بہاولپور کے انگریزی مباحثات میں ہماری ٹیمیں دوسرے نمبر پر آئیں۔

انفرادی انعامات (۱) نور محمد چانڈیہ نے گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے مباحثہ میں تیسرا۔ اور بہاولپور میڈیکل سکول اور نشتر میڈیکل کالج ملتان کے مباحثات میں اوّل انعام حاصل کیا۔
(۲) سید مشہود احمد شاہ نشتر میڈیکل کالج ملتان کے انگریزی مباحثہ میں دوسرا انعام حاصل کیا۔

مجلس ارشاد

○ محترم سید کمال یوسف صاحب مبلغ سکنڈے نیویا نے "سکنڈے نیویا میں اسلام" کے موضوع پر تقریر کی۔

○ مجلس ارشاد کے معتمد چوہدری رشید احمد جاوید نے مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے مقالہ نویسی کے کل پاکستان مقابلہ میں بہترین مقالہ لکھ کر اول انعام حاصل کیا۔ آپ نے "اسلام و امن عالم" کے موضوع پر مقالہ لکھا۔

○ سویڈن سے ہمارے نومسلم بھائی جناب سیف الاسلام محمود صاحب نے طلبہ سے خطاب کیا۔ آپ نے اپنے قبول اسلام کے ایمان افروز حالات بیان کئے۔

مجلس اقتصادیات:۔ محترم صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب نے "معاشی مسائل" کے موضوع پر طلبہ سے خطاب فرمایا۔

مجلس تاریخ:۔ پروفیسر حمید الدین صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات گورنمنٹ کالج لاہور نے "۱۸۵۷ء کی اہمیت" پر لیکچر دیا۔

مجلس فلسفہ و نفسیات:۔ محترم صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب

(باقی دیکھیں صفحہ [illegible] پر)

طلبہ کی ذمہ داریوں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

۲۱ نومبر کو ایک انگریزی مباحثہ بعنوان "Wisdom and piety can only be found among the poor" ہوا۔ مشہود احمد، مبارک احمد، اور رشید احمد جاوید بالترتیب اوّل دوم اور سوم رہے۔

۲۲ نومبر کو اردو مباحثہ بعنوان "دنیا کی رہنمائی صرف شاعر اور ادیب ہی کر سکتے ہیں" منعقد ہوا۔ جس میں کریم قمر اوّل اور جاوید حسن دوم آئے۔

۵ دسمبر کو ایک آل ربوہ انعامی اردو مباحثہ بعنوان "توہین زندگی ہے بہاروں کی زندگی" منعقد ہوا۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول کے پرویز طارق اور مرزا فرید احمد اول اور سوم آئے عطاء المجیب راشد تعلیم الاسلام کالج دوم رہے۔ اگلے روز ۶ دسمبر کو آل ربوہ انعامی انگریزی مباحثہ بعنوان "There should be a change in the foreign policy of Pakistan" منعقد ہوا۔ جامعہ احمدیہ کے یوسف عثمان اوّل، تعلیم الاسلام کالج کے نور محمد چانڈیہ دوم اور برکت اللہ ظاہر سوم آئے۔

۱۵ جنوری ۱۹۶۳ء کو امریکی شعبہ اطلاعات لاہور کے آفیسر برائے ثقافتی امور پروفیسر ڈاکٹر ولیم۔ سی۔ کرک نے "امریکی طالبعلم کی زندگی" کے موضوع پر طلبہ سے خطاب کیا۔

کل پاکستان بین الکلیاتی مباحثات میں شرکت

عرصہ زیر رپورٹ میں کالج کے مقررین نے گورنمنٹ کالج کوئٹہ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد، ایمرسن کالج ملتان۔ ویسٹ پاکستان میڈیکل سکول بہاولپور، نشتر میڈیکل کالج ملتان اور گورنمنٹ کالج منٹگمری کے کل پاکستان بین الکلیاتی اردو و انگریزی مباحثات اور مشاعروں میں شرکت کی۔

ٹرافی:۔ کالج کے مقررین نے نشتر میڈیکل کالج ملتان کے کل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی مباحثہ کی ٹرافی جیتی۔ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد اور میڈیکل سکول بہاولپور کے انگریزی مباحثات میں ہماری ٹیمیں دوسرے نمبر پر آئیں۔

انفرادی انعامات: (۱) نور محمد چانڈیہ نے گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے مباحثہ میں تیسرا۔ اور بہاولپور میڈیکل سکول اور نشتر میڈیکل کالج ملتان کے مباحثات میں اوّل انعام حاصل کیا۔

(۲) سید مشہود احمد شاہ نشتر میڈیکل کالج ملتان کے انگریزی مباحثہ میں دوسرا انعام حاصل کیا۔

مجلس ارشاد

محترم سید کمال یوسف صاحب مبلغ سکنڈے نیویا نے "سکنڈے نیویا میں اسلام" کے موضوع پر تقریر کی۔

مجلس ارشاد کے معتمد چوہدری رشید احمد جاوید نے مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے مقالہ نویسی کے کل پاکستان مقابلہ میں بہترین مقالہ لکھکر اوّل انعام حاصل کیا۔ آپ نے "اسلام اور امن عالم" کے موضوع پر مقالہ لکھا۔

سویڈن سے ہمارے مسلم بھائی جناب سیف الاسلام محمود صاحب نے طلبہ سے خطاب کیا۔ آپ نے اپنے قبول اسلام کے ایمان افروز حالات بیان کئے۔

مجلس اقتصادیات:۔ محترم صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب نے "معاشی مسائل" کے موضوع پر طلبہ سے خطاب فرمایا۔

مجلس تاریخ:۔ پروفیسر حمید الدین صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات گورنمنٹ کالج لاہور نے "۱۸۵۷ء کی اہمیت" پر لیکچر دیا۔

مجلس فلسفہ و نفسیات:۔ محترم صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب

(باقی دیکھیں صفحہ پر)

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ

فِیْ مَدْحِ النَّبِیِّ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

یَا لَلْفَتٰی مَا حُسْنُہٗ وَجَمَالُہٗ	رَیَّاہُ یُصْبِی الْقَلْبَ کَالرَّیْحَانِ
واہ کیا ہی خوش شکل اور خوبصورت جوان ہے	جس کی خوشبو دل کو ریحان کی طرح شیفتہ کرلیتی ہے
وَجْہُ الْمُھَیْمِنِ ظَاھِرٌ فِیْ وَجْہِہٖ	وَشُؤُوْنُہٗ لَمَعَتْ بِھٰذَا الشَّانِ
اس کے چہرے سے خدا کا چہرہ نظر آتا ہے۔	اور اس کی شان میں خدا کی شان نمایاں ہے
فَلِذَا یُحَبُّ وَیَسْتَحِقُّ جَمَالُہٗ	شَغَفًا بِہٖ مِنْ زُمْرَۃِ الْاَخْدَانِ
اس لئے تو وہ محبوب ہے اور اس کا جمال لائق ہے کہ تمام	دوستوں کو چھوڑ کر اسی کے جمال سے وابستگی پیدا کی جائے
سَمْحٌ کَرِیْمٌ بَاذِلٌ خِلُّ التُّقٰی	خِرْقٌ وَفَاقَ طَوَائِفَ الْفِتْیَانِ
خوش خو کریم سخی صاحب تقوٰی	کریم الطبع اور تمام جوانوں پر فائق
فَاقَ الْوَرٰی بِکَمَالِہٖ وَجَمَالِہٖ	وَجَلَالِہٖ وَجَنَانِہِ الرَّیَّانِ
اپنے کمال اور جمال اور جلال اور تازہ دل کے	سبب سے تمام مخلوق سے بڑھا ہوا ہے
لَا شَکَّ اَنَّ مُحَمَّدًا خَیْرُ الْوَرٰی	رَیْقُ الْکِرَامِ وَنُخْبَۃُ الْاَعْیَانِ
بے شک محمد صلے اللہ علیہ وسلم خیر الورٰی	برگزیدہ کرام اور چیدہ اعیان ہیں
تَمَّتْ عَلَیْہِ صِفَاتُ کُلِّ مَزِیَّۃٍ	خُتِمَتْ بِہٖ نَعْمَآءُ کُلِّ زَمَانِ
ہر قسم کی فضیلت کی صفتیں آپؐ میں کامل ہیں	اور ہر زمانہ کی نعمتیں آپؐ کی ذات پر ختم ہیں۔

to acts of violence. Whoever may be the organiser and whatever may be his objects, the strikes ultimately end in lawlessness, confusion and acts of barbarism. Thus strikes may temporarily appear to be an effective method of forcing one's demands but in the long run they are extremely harmful and and ruinous They weaken the strength and destroy the prestige of a country and lower it in the estimation of others. They only provide an opportunity for the enemies to step in and make matters worse.

Apart from the question of the extent of immediate advantages, if any, which one party or the other, especially the student community, is liable to obtain from a stoppage of work we have to consider the effects of strikes on the community as a whole. Stoppages of work are in their very nature wasteful. In attempting to estimate the utility or disadvantages of strikes, whether to the students or to the community as a whole, it is insufficient to take into consideration the loss incurred in terms of lessons missed, days wasted, window-panes and chairs broken, cars burnt or teachers insulted and to balance these against the immediate gains made. Strikes not only lead to complete dislocation of teaching programmes but also cause extreme frustration among students as well as parents. Many of them begin to doubt the very value of sending boys to schools and colleges. All their hopes of seeing their children qualify as a doctor, engineer or a lawyer etc. are completely blasted.

There is yet another aspect of the matter. We hear students demanding that a three-year course be reduced to two, or pass percentage be reduced from 40 to 33. It is just possible that under pressure of circumstances the authorities may yield and the students may score an apparent victory. They may exult and feel happy over it. But the ultimate effect of forced concessions may be damaging instead of advantageous to them. It would certainly lower their efficiency and national prestige. The standard of education in our country is already very low. Foreign universities refuse to recognise our graduates. Under these circumstances is it wise to cut short the period of training or reduce the courses and make excessive demands? Education, after all, is not a pill that can be forced down the throat of a student. It requires sustained effort and labour and takes time. If an attempt is made to learn or teach a three-years course in two it will have to be done in undue

haste and will not be thoroughly assimilated. We might feel that we have an achievement but in reality we shall be deceiving ourselves. Let alone beating the West, we cannot come up to their level in technology, commerce, trade and science unless we put in more effort, more energy, more labour and work. Supposing the university declares that in future the pass marks for a degree student will be 20 percent. Do you think that a candidate qualifying with that minimum will really be a qualified fellow? If not, then why hanker after low pass percentages and reduced courses. Are such demands reasonable and justified? Are they in the interest of our own well-being? Most surely not.

Let us look at this problem from another angle. From the pulpit and the platform we are being constantly told that we should establish an Islamic way of life in Pakistan. Our leaders also do not tire of crying from house tops that Pakistan should be an ideal Islamic state. Well, nodody would disagree with them in this matter. But let us see what is the Islamic way of life which they demand. In simple words it means establishing the rule of the Holy Quran and moulding our lives according to the instructions contained in it.

Now let us have a look at the Holy Quran and see what guidance it gives in this respect. First of all it says:

تعاونوا على البر و التقوى

"Co-operate in what is righteous and good." Now what are strikes? Do they not amount to bringing about a change in the established condition by unconstitutional methods and by resorting to coercion, intimidation and even violence. If we break laws, be they government laws, university regulations or college rules; and in so doing create an atmosphere of unrest and lawlessness; we are acting against the teachings of Holy Quran.

Again the Holy Quran says:

الفتنة اشد من القتل

"Creating lawlessness and endangering public peace is worse than killing." If the Holy Quran is right and it certainly is, what would you honestly say about strikes? Do they not disturb peace and tranquillity and lead to unrest? Certainly they do. If we really feel that Islamic way of life should be established in our country we shall have to think over again on the desirability or rather advisibility of resorting to strikes. What is repugnant to to the Holy Quran cannot possibly be good for us.

Even the West has discarded the way in which our strikes are organised. They have learnt by experience that uncontrolled strikes do more harm than good. They have now adopted legal and constitutional methods for getting their grievances redressed. Now they recognise trade unions and employers' associations working under the guidance of strong but moderate leaders. No strikes are permitted without the sanction of these central organisations. Most of the labour disputes are settled by negotiations or by mediation and arbitration. Something of the same type should be set up; advisory committees consisting of teaching authorities, representatives of students and public men such as lawyers, educationists etc. to discuss all problems relating to the welfare of the student community. There should also be frequent consultations and more co-operation between the teachers and the taught on the one hand and teachers and parents on the other. The pity is that we accept this in principle but do not put it in practice.

Lastly a word about hunger strikes. As far as hunger strike is concerned, it is completely an innovation of Mr. Gandhi. It indicates complete helplessness and mental bankruptcy of the person who adopts this measure as the last resort. Psychologically this act is an outcome of extreme despair and betrays utter lack of confidence in one's self and in the Creator. After all what logic is there in this behaviour? If A & B quarrel with each other and A takes poison because B does not agree with him, will that show that justice and reason are on the side of A? As a matter of fact, going on a hunger strike is a confession of weakness of one's case. In the present age of democracy whatever appeals to the mind and is just and reasonable cannot long be ignored even by a dictator or a despot. So instead of resorting to hunger strike one should try to appeal to reason and should repeatedly explain one's viewpoint to the people concerned in a desirable manner.

Looking at the matter from religious point of view we come to the conclusion that going on a hunger strike is a complete folly. The Holy Quran says:

لا تلقوا بايديكم الى التهلكة

"Do not cast yourselves into ruin with your own hands" (2 : 196). Thus going on a hunger strike and knowingly endangering one's life is committing suicide and ignoring the Quranic injunction. It is a crime in the eye's of law and a sin according

to "shariat." One cannot expect any good coming out of a practice which is repugnant to the Holy Quran and is directly opposed to the will of God. All blessings lie in complete obedience to His behests. He who flouts them, dies a miserable death and harms no body except himself.

Moreover, our experiences so far tell us that a person who professes to go on fast unto death is a liar and a hypocrite. He knows fully well that his relatives, well-wishers and doctors attending him will not allow him to end his life in that manner. He would continue to be fed secretly or through unnatural methods for sometime and then there would be an end of the whole show. Such a person tries to deceive others. If he is serious in his profession and really makes up his mind to surrender his soul he is committing suicide as mentioned above. According to tradition Muslims are forbidden to offer prayers at his funeral. In case he is not serious he is a hypocrite He is exploiting the situation to gain popularity and acquiring the status of a leader or a hero. In either case he follows his own wishes and incurs the displeasure of God.

Thus any person who indulges in the practice of hunger strikes is either befooling us or committing a sin. Does such a person deserve any sympathy? Should he be acclaimed as a hero? Most certainly not. This practice is a breach of law and a public nuisance. The germs of this evil are gradually spreading in our society. It is high time we nipped the evil in the bud. The Holy Prophet has said, "If you see anything evil, stop it with your hand if you can. In case this is not possible, denounce it in clear terms and raise a hue and cry against it. If that also is not permitted, at least feel in your heart that it is an evil and dissociate yourself from it."

The Badshahi Mosque

Amongst the many splendid monuments that came into existence under the royal patronage of the Great Mughals, the Badshahi Mosque at Lahore is a perennial mark of Aurangzeb's religious fervour and refined taste and the chime of its glory shall continue to resound even in the days to come.

The Badshahi Mosque is situated on the opposite side of the Lahore Fort. Between these two massive buildings is Hazuri Bagh with a Bara Dari in its middle. From here we can see the entrance gate of the Badshahi Mosque while its four lofty towers, made of red-stone, can be seen easily from afar. Its main gate is accessible by means of a stair with 22 steps made with the famous red stone of Kabul called *'Abri'*. The biggest step of this stair is 79ft 3" in length while the shortest one is 20ft. long. On the rectangular plate of marble fixed above the main gate is this inscription.

> "This mosque, constructed under the supervision of Fidai Khan Kuka by the order of Abu Muzaffar Muhyyuddin Badshah Ghazi, was completed in 1084 A.H".

Fidai Khan was, according to Bernier, the greatest Mughal engineer. According to *'Khulasa tu Tawarikh'*, more than six lakhs of rupees were spent on the construction of this mosque and was completed in 1673 A.D.

The interior court-yard of the mosque is 530 ft from North to South and 527 ft from East to West, with a pool and a fountain in its centre. On the Western side of this courtyard is the main hall of the mosque with its majestic roof supported by beautiful, lofty and impressive columns. Its three huge domes of marble attract the people from far and wide. The beauty of its cupolas and the pulpit is indescribable. Its four towers, made of red-stone, are 143 ft. 6" high. Their exterior circumference is 67 ft and interior circumference is 8 fts. Inside the towers are stairs for reaching the topmost storey with loopholes for entrance of fresh air. Although their is

no decoration on these towers yet their magnificence is disguised in their commanding heights. The earthquake of 1840 A.D. damaged the towers but they have been repaired now by archaeology department and have become picturesque once again.

It would be interesting to say a few words about the material used in the construction of this mosque. It is said that Dara Shikoh, the elder son of Shah Jahan, had treasured a huge amount of red-stone at Lahore either for building the mausoleum of his Pir, Hazrat Mian Mir, or for constructing a road from the Lahore Fort to the Tomb of Hazrat Mian Mir, but he could not carry out his ambition because of the ascendancy of Aurangzeb who now ordered for the construction of a mosque from the same material in the vast parade ground opposite the Fort.

After Aurangzeb, the Mughal rule was weakened and it affected Lahore, too. In 1710, Shahinshah Bahadur Shah came to Lahore. According to Syyad Abdul Latif, the emperor belonged to Shia school of thought which he wanted to set in vogue in Lahore also. Accordingly, he ordered the Khatib to add the words of "Aliun walliullah wasiy-u-Rasulillah" along with Kalima-i-Tayyiba in the Khutba to be read in the Badshahi Mosque. Having obeyed the order, the Khatib had to lose his life at the hands of Sunni Muslims. This was the first sound of schism which resounded in the domes of history. After this the Muslims of Indo-Pak began to disintegrate till the day came when the Sikhs assumed power and Maharajah Ranjit Singh occupied Lahore.

By the order of Ranjit Singh, the Badshahi Mosque was used as an artillery. Now the whole position was altered. On the one side was the Fort, on the opposite side was the royal artillery and in between them was constructed the 'Royal Court' now called the Bara Dari of Hazuri Bagh. For the construction of this Bara Dari, marble was snatched from the tomb of Zaibul Nisa, the daughter of Aurangzeb. After the death of the Lion of the Panjab, Sher Singh used the same Bara Dari as his court. It was in those days when guns were placed on the towers of the Badshahi Mosque for attacking the Lahore Fort and shots were fired on the Dogras who afterwards became the rulers of Kashmir. A few days later the forces of the Prime Minister Hira Singh, again bombarded the Lahore Fort with several casualties and caused a

great damage.

After this the English occupied India and the Badshahi Mosque was used as "English Artillery". It was in the reign of Queen Victoria that this mosque was returned to the Muslims of Indo-Pak at their frequent requests. The Muslims thanked the English and prayed for the long life of Queen Victoria.

The efforts of Sir Sikandar Hayat Khan, the then Chief Minister deserve special mention in this connection. It was he who collected 40 lakhs of rupees by levying a tax on the Muslims of Punjab and started the work of repairing the Badshahi Mosque. His last resting place is situated on the southern side of the stairs of the mosque.

The work of its repairing continued even after the establishment of Pakistan and reached completion last year. Now its pristine beauty has returned once again and the more we look at it, the more we admire its builders.

Virtue and learning, like gold, have their intrinsic value, but if they are not polished, they certainly lose a great sort of their lustre and even polished brass will pass upon more people than rough gold.

(From a letter of Lord Chesterfield to his son.)

A man with knowledge but without energy, is a house furnished but not inhabited; a man with energy but no knowledge, is a house dwelt in but unfurnished.

(John Sterling.)

Muhammad Azeem Khan

Under the Cedar Tree

Here under the cedar tree,
Who is ready to accompany me ?
Scattering lovely smiles ;
Giving not wiles.

Here under the cedar tree,
Forget the grief and laugh,
No one tease thee,
Perhaps sorrows are off.

Here under the cedar tree,
One can see me,
Observing the blowing breeze,
Scattering green pretty leaves,
While crossing the red flowers
Just as recalling past hours.

Parwiz Kassim Hossen

WILL POWER

It is an established fact that man is distinguished from the lower animals by one of his most characteristic feature—his will power. The reforming stages of the evolution of mankind have been brought about by that very outstanding feature in the character of man.

Will Power can be defined as an impulsive force which urges somebody to do things which are supposed to be beyond his capabilities. There is no doubt that any decision taken is usually accompanied by great constitutional firmness. The most striking and vivid example of such will was clearly shown by the founder of Pakistan, Mr. Muhammad Ali Jinnah.

While fighting for the independence of his country, one of his most cherished objective, he made it clear to his colleagues that there was no alternative for the Muslims, unless they stood as one body and focused their efforts in one channel only. His strong-willed nature was clearly shown while he was addressing the Leaguers. He told them "Think a hundred times before you take any decision and once taken, stand by it".

It goes without saying that the world takes us at our own valuation. It believes in the man who is confident and not afraid to go ahead. A timid man, who cannot rely upon his own judgement, is likely to become a useless member of society. But the one with a positive nature and who is confident of success, soon wins popularity and tops the rank.

In this competitive age there is little room for one who is confident in others and who cannot rely upon himself. But he who never admits defeat or poverty and always steps bravely to the front to overcome whatever opposes him, the world always makes a way for him. It is worth remembering that to remain in this world we must be useful, otherwise nature regards us as old metals and is only watching for a chance to melt us down.

Many are those who are poverty-stricken and yet they express a firm desire to secure higher education. Such people as long as they were hoping and striving to distinguish themselves, were faced by mountains of difficulty. But once their hopes were fashioned into fixed purposes and their efforts focused, they achieved marked success. Great abilities are of little use to without will power.

During my educational career I have encountered many intelligent students. Most of them failed to succeed simply because they lacked strength of will. Very often the average student, who has got the power of unification and can direct his efforts to one central aim, makes remarkable progress.

"Perseverance is the road to success". Perseverance is nothing but the centralizing of one's will power in a single direction. It is a pity to see how many of us lack this characteristic quality. Though we are bold and reckless, we lack grit and give way as soon as we encounter difficulties.

We must always remember that will power is the backbone of personality, without it there is no life, we become helpless and faint. But if we master ourselves and develop our will power to exercise it in the business of every-day life, we are sure to achieve marked success in any sphere.

"The difficult we do at once,
the impossible may take a
little longer."
Genius, that power which
dazzles mortal eves,
Is oft but perseverance in dis-
guise."

Abdul Ghafoor Ihsan,

BED

I am in the bed at this time, undressed and clad in bed clothes. I request the reader to read this essay in the bed, so that 'Bed' written 'in bed' should be read 'in the bed'.

As soon as your study time begins, plunge into this paradise, the pretty world of peace and pleasure. Push out the pillow so that it may be supporting the head at an angle at which you may lie sideways: this magazine held in one hand, its edge resting on the pillow. Light coming from the shade will radiate the pages of 'dear Al-manar'. Now you are in the bed, in warmth and comfort and you may read.

You can say, "We cannot study at night."

Use your bed and you will study, perhaps throughout the night. Remember that this article is in the issue of January and February. You will never get to sleep on 'Al-manar' which by its beauty excites you and its knowledge imparts you. And when there is no more amusement and delight in you for Al-Manar, lay the magazine aside, push out the light and the dark bed like a gentle pool of water receives you and you will sink into its encompassing arms.

I do not think that there is any man who, once in the bed of pleasure, will desire to get out of it. But all of us every morning, desert this sheltering couch so that the business of life may not stop. It is strange that in our lives each day, how ever long, however short, however weary, however merry, ends in getting into bed.

I do not mean, we perform nothing in the bed. So much of the world's business has been performed in the bed that even to begin to consider it will require comfort and silence of the bed. Many emperors and dictators, lying in their beds enjoyed the dance and music of dancers. Hobbes did mathematics, drawing lines on his thigh and on the sheets; generals planned victories and ordered attacks; kings of France received their ministers in bed and dispensed affairs of the

state and Prime Ministers received the news of victories ; men are born in the bed and frequently die there ; programmes are made and cancelled ; Samuel Peppys lay late with great pleasure, and Samuel Johnson lay all his life till noon or till afternoon telling young men that nobody who did not rise early would ever come to good. I say with deliberation that more should be done in the bed.

I read once, in a book 'Go to the ant, consider her ways and be wise'. Consider the ant's way and be wise indeed, because her and our works are alike. But we need not mind if ants leave their beds early in the morning. Instead of replying, as we do, to those who awake us, "You have awakened me too soon. I must slumber again." It is a pity for these hard working insects that they have never invented any easy bed.

Those who leave their beds very soon, I believe, have poor miserable resting place as compared with ours. Perhaps, they do not see dreams, they do not hear the ticking of the clock and lovely songs of birds.

The writer of the above mentioned book also says, 'Rise early and bed late'. But he does not explain why one would be better out of the bed than in.

I am a great lover of bed. I always want to get into bed and not to get out of it, because going to bed is nocturnal pleasure and not getting out of it a perennial one. Sometimes I wake up early in the morning but the picturesque hills, seen through my window glass especially when there is fog and the news that first three periods are vacant do not allow me to get out of the bed before 10-30 a.m. Sometimes my friends, while going to college, see me in the bed and ask, "Are you ill ? Are you not feeling well ? When are you to rise ? How long will you sleep ?"

"No, I am not ill, I am merely philoclinic"—This is my answer.

Michael Williams.

ASPECTS OF ENGLISH UNIVERSITY LIFE

There are about twenty five universities in England. They differ quite a lot from the universities in the ugly great cities like Manchester and Birmingham to the smaller universities in the ancient cathedral cities such as Exeter and Durham. But there are even greater differences between those and the colleges of Pakistan, and I shall describe the chief differences that I have noticed in my short stay here.

First of all, there is in England a very hectic college life run by the students themselves. A whole host of societies is for ever organising meetings, lectures, debates and so on. You can join political societies and work for world revolution, or join sports societies and forget all about politics. There are even societies for the promotion of tiddly-winks. In fact it is often difficult for a student to fit in all these activities and his academic work as well, not to mention the frequent parties, dances, and trips to the country.

Lectures start at nine and last for an hour each. Some students have as few as six lectures a week. But they are supposed to be able to look after themselves and the libraries are well used. The attitude of the students towards the university is very different from the prevalent attitude here.

A student in England can leave school when he is sixteen and start earning eight or nine pounds a week. By the time he is 22 he may be earning anything from ten to twenty pounds a week. While someone who stays at school for another three years and then spends three years at University will be lucky if he earns any more than that and may well earn less. So university is regarded not so much as a means to an end but as an end in itself. An end too of youth and freedom, of gay times, of learning for the sake of learning, before going out into the bleak commercial world. Thus the student in England tries to pack as much experience into his university life as he can. The syllabus is irrelevant. His teachers are men from whose learning he hopes to benefit, but

(Continued on page 27)

A Rafey Jafrey

Be a Back Garden Explorer

Suddenly last summer, we were all struck by, what we thought to be a great catastrophe, because my father was called up by the Head Quarters of the Uganda Education Department for an emergency meeting.

We were sitting in our parlour, polishing our programme to tour the whole of East Africa during our Summer Vacation, when the messenger brought in the telegram. We all cursed the messenger in our dismal mood, but for me it turned to be a blessing in disguise as I spent the most interesting vacation in exploring my own back garden.

Perhaps you too might be spending your holiday at home this summer and won't have a chance to go exploring among the caves and rock pools of the seaside. There is still plenty of exploring you can do at home—in your own back garden. No matter how small your garden is, it contains a whole menagerie of amazing creatures.

Stoop down and see what is happening under the leaves and in the grass. A close look will lead you into a wonderland where the flower-beds and grass-plots become forests or jungles, inhabited by creatures as strange as any you could find in Tasmania or Timbuctoo. Like a streamlined armoured car, a beetle looms up over the edge of a leaf. It is one of the strongest animals in the world—some beetles can support 850 times their own weight. If an African elephant could do as well, it could carry a goods train on its back. An ant runs this way and that. It is following a scent-trail of formic acid laid down by other ants, using a sense of smell keener than any box bloodhounds.

Flies made like Fighter Planes

From a tip of a plant a robber fly designed like a fighter plane, darts aloft, snatches a gnat from the air and returns to its base. There are twenty-six kinds of robber fly; some have a special "beat" which they patrol for food. Alhough they see their tiny victims through large, bulging eyes that contain as many lenses as the eyes of several

hundred human beings, robber flies do not really see very well. They are attracted by any movement in the air, and will sometimes chase a piece of thistledown by mistake.

Six-Legged "Lions".

I remember the morning I first came across a dewy iris leaf from which many small oval objects stuck up like lollipops, at the tops of thread-like stalks. These are the eggs of the gauzy-winged golden eyed lacewing fly. From them hatch "aphislions" — baby lacewings — which spend their days eating immense numbers of greenfly. So greedy are these six-legged "lions" that the first to hatch would gobble up all its brothers and sisters if they were not on stalks to keep them out of reach.

Ants That keep "Cattle"

I can also recall my first meeting with cattle-keeper ants. Clustered along a rose shoot were a hundred or more green fly, little round creatures calmly sucking the sap through their hollow, needle-sharp beaks. So many were there that they stood shoulder to shoulder like a flock of feeding sheep. Among them, half a dozen black ants were stretching out their antennae, or "feelers", gently stroking the the backs of the smaller insects. This "milking" action makes the greenfly give off tiny drops of sweet-tasting fluid which the ants like to eat. The ants also guard the greenfly from insect enemies. They even take them into their nests in the autumn, keep them safe during the winter, and put them "out to pasture" when spring arrives. Ants have been tending and milking their insect cattle for at least two hundred million years-you can see them at it in almost any garden on almost any summer day.

A House of Bubbles:

Scattered among the plants of your garden every spring, you will see spots of snow-white foam, usually called "cuckoo-spit". Each snow-speck, about the size of a pea, is the foam-castle of a baby froghopper. The tiny froghopper, only an eighth of an inch long sucks the sap from plant stems and blows it into frothy bubbles, using its own "bellows" formed of overlaping plates beneath its body. Hidden inside its bubble walls, the froghopper is invisible to its enemies and is also protected from the heat of the sun. There it lives until it is big enough to grow wings and fly away.

Garden Visitors:

Insects such as ants and greenfly are usually old settlers in the garden. Many others are just callers, paus-

ing on their way to feed among the leaves and flowers. Bees, with eyes that can see ultra-violet light which is only blackness to us, hover among the blossoms. Dragon-flies—creatures that begin life under water, breathing through gills like fish—swoop over the garden scooping insects out of the air in nets formed by their spiny legs. Your garden may be visited by one of those gorgeous creatures of the night, the privet hawk-moths. Some of these large and beautiful insects, such as the Emperor Moth, emerge from their cocoons, live and mate and die without once tasting food. All their eating is done during caterpillar stage. The long-distance traveller is the painted lady butterfly from North Africa. Instinct the most mysterious compass of all, guides them on their journey to this country.

What you will need.

Scientists have shown that there are nearly 900,000 different kinds of insect. All of them are interesting. The equipment you need to enter their world is simple and cheap. A guide, such as the Observer's Book of Insects, will help you to recognize the creatures you meet. A strong pocket magnifying glass will put you on closer terms with the more minute insects. If you have a camera there is a whole new world for you to photograph. A torch, used after dark, can make your garden adventures even more exciting. In the circle of its light, wood-lice creep likes midget armadillos, daddy long legs go bobbing past with eyes that peer from the top of little turrets rising from the middle of their backs, and pale tan-coloured moths hover in the air with eyes that shine like rubies. In exploring at home there is always the chance that you will make a new discovery For years no one knew how a certain spider snared its prey, because no one had ever seen it make a web. Then, in his back garden. a boy solved the problem. He saw the spider hastily put up a small web after dark and take it down before dawn. The most famous back-garden explorer was the great French naturalist Henri Febrie. As a boy he had dreamed of journeying to the Andes and Amazon, but he could never afford to go to the far away places. Instead, he made many exciting discoveries nearer home.

X-Rays

The desire for revealing the dormant elements in the universe is ingrained in the nature of man. Consequently, he has been going on with his research work from times immemorial and his hard labour has borne fruit in the twentieth century to a considerable extent. Among such seekers of hidden elements was Roentgen who discovered X-rays which we shall discuss in some detail here.

In 1895, while investigating electrical discharges through gases and the effects of Cathode rays, he found that a fluorescent screen outside the tube would light up, even when it was shielded from the direct light of the gaseous discharge. Apparently, some penetrating radiation were being emitted by the gaseous discharge tube. For lack of a better name for these strange and new radiations, they were named X-rays. After investigating the properties of these radiations for several months, Roentgen reported many basic facts about them in several papers appearing in 1896. These basic properties are listed below :

1. Fluorescence is excited in many materials, such as calcium tungsten, barium-platino-cyanide, and others.

2. Photo-graphic emulsions are affected by X-rays, thus providing an excellent method for the study of the radiations.

3. Electrified objects lose their charge when irradiated with X-rays.

4. Various materials are more or less transparent to X-rays, the differences in transparency providing the basis for examining the internal structure of objects which are opaque to visible light.

5. X-rays can be collimated with slits or pin-holes, showing that radiation travels in straight lines, like light.

6. Magnetic fields do not deflect an X-rays beam, showing that X-rays are not a stream of charged particles.

7. X-rays are generated whenever a beam of electrons strikes an obstacle. Furthermore, elements of high atomic weight are the most efficient sources of X-rays.

In the *X*-ray tube, cathode rays are emitted from a concave cathode. They are made to fall on a target, called anticathode, which is generally made of tungsten. The anticathode is held at 45° to the axis of the cathode ray beam and is connected to the anode. When cothode rays strike against the target of tungsten, they give rise to X-rays.

The uses of X-rays are well known in medical diagnosis, and this was one of the earliest applications of X-rays. Since bones are of greater atomic weight than tissues, the absorption of bones is greater than that of tissues, so that bones show up as light regions on a photographic negative when X-rays are passed through the body. In order to make intestinal pictures, the patient drinks a harmless compound of bismuth or barium, either of which is a good absorber which shows up dark in a positive X-ray photograph, to obtain contrast in other parts of the body, since it is a better absorber than tissue.

Technological application of X-rays are almost too numerous to consider. For instance, flaws in large castings which are inaccessible to direct observation may be discovered when the casting is X-rayed. Thickness of material can be measured without cutting or disturbing the sample, by comparing the absorption of X-rays in the sample with the absorption in a standard sample of known thickness.

Irradiation of living cells may be lethal to the cells. The process seems to be that the X-rays knock high-energy photoelectrons from the atoms in the cells, and these photoelectrons may eject additonal electrons from atoms in nearby cells. The changes in molecular structure produced in this way may cause biological changes in the cells and may even kill them. Rapidly growing cells, such as cancerous growths appear to be, are more susceptible to destruction in this way than normal cells, so that a selective effect occurs which is the basis for radiological treatment of cancer. Thus, cancer may be destroyed without harming too many nearby healthy cells.

Mueller found in 1927 that X-rays can alter or destroy the genes of fruit-flies, thus producing mutations. This has been found to be true of many organisms and

(Continued on page 27)

Rashid Ahmad Javed

ISLAM ON WORLD PEACE

THE QURANIC LEAGUE OF NATIONS

It is very important in the interest of a rapidly developing world that there be perfect peace and tranquillity in it. Only the peaceful world may warrant humanity to achieve the highest possible degree of evolution both in spiritual and temporal life. History of the world bears evidence to the fact that whenever nations overlooked the role of peace and gave way to differences, conflicts and wars, not only that they could not proceed on further, it took them decades of years to make up the deficiency so caused. In the light of this fact, therefore, it is of supreme importance that some institution, on a worldwide basis, be created which could be held responsible for the maintenance of peace and order in the world. Two institutions have so far emerged to this effect. It is however, to the utter disappointment of a peace-loving mind that both of them failed badly in the attainment of their principal goal. There were and still are some basic defects and short-comings which chiefly account for this failure. If such organisations are to render some useful services they must be alive and effective to the utmost.

With this brief introductory note I now present before you the "Islamic Concept of the League of Nations" God Almighty says in the Holy Quran :

وان طائفتن من المومنين اقتتلوا فاصلحوا
بينهما فان بغت احديهما على الاخرى فقاتلوا
التى تبغى حتى تفئ الى امر الله ـ فان
فاءت فاصلحوا بينهما بالعدل و اقسطوا ـ
ان الله يحب المقسطين .

"And if two parties of believers fight *against each other*, make peace between them ; if *after that* one of them transgresses against the other, fight the party that transgresses until it returns to the command of Allah ; then if it returns, make peace between them with equity, and act justly ; verily, Allah loves the just. (Al-Hujurat, 10)

حضرت حافظ سید مختار احمد صاحب شاہجہانپوری
(یادگارِ ملک الشعراء حضرت امیر مینائی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ذیل کے اشعار حضرت حافظ صاحب کے اس طویل قصیدہ سے لئے گئے ہیں جو آپ نے ۱۹۲۹ء میں محترم خواجہ غلام نبی صاحب مرحوم ایڈیٹر الفضل کی درخواست پر تصنیف فرمایا۔ اور الفضل کے ۳۱ مئی ۱۹۲۹ء کے پرچہ میں شائع ہوا ——— (ادارہ)

اللہ اللہ شانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم — عرشِ عظیم ایوانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

پیشِ نظر ہے شانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم — کیوں نہ ہوں پھر قربانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

صبح روزِ ازل سے لیکر ختم نہیں تا روزِ محشر — سلسلۂ احسانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

راحت پر راحت دیتا ہے کیا دکھ موجیں لیتا ہے — دریائے فیضانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

اے کہ جسے لاحق ہے سراسر خوفِ تاپِ مہرِ محشر — آ زیرِ دامانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

آپ فدائے خلقِ خدا ہیں آپ شفیعِ روزِ جزا ہیں — مژدہ اے خواہانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

جملہ رسولوں سے ہے نرالا فہم و بشر سے رفع و علا ہے — ہر ہر جلوہ شانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

آپ نے سب پر شفقت کی ہے سب کو دین کی دعوت دی ہے — عالم ہے مہمانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

اے جو یائے ہدایت آجا، آجا طالبِ جنت آجا — جنت ہے بستانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

ہمت والو نیک جوانو! شمعِ رسالت کے پروانو! — دیکھو تو فرمانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

بیداری کا وقت یہی ہے تیاری کا وقت یہی ہے — ہشیار اے شیرانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

خود جاگو اوروں کو جگادو، عالم میں اک دھوم مچادو — اے غیرتمندانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

موقع ہی یہ نصرتِ دیں کا، وقت نہیں و اللہ نہیں کا — ہاں اے شیدایانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

دشت و جبل میں بحر و براں میں سارے عرض و طولِ جہاں میں — پہنچا دو فرمانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

مشرق کو مغرب سے ملادو، کونے کونے میں پہنچا دو — تذکرۂ احسانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

ہو جو مقابل سارا جہاں ہے لو یہ گو ہے یہ چوگاں ہے — اور یہ ہے میدانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

کچھ ہو لیکن آن نہ جائے ہاتھ سے یہ میدان نہ جائے — ہمت اے مردانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

بات تو جب ہے دیکھ لیں یکسر دنیا کے سب اسود و احمر — جلوۂ حسنِ شانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

عالم کو سرمست بنادو سب کو تا امکان چکھا دو — صہبائے عرفانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

بختِ رسا پر نازاں ہوں میں فضلِ خدا پر نازاں ہوں میں — پایا ہے فیضانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

ناممکن ہے ناممکن ہے مجھ سے ادا ہو کیا ممکن ہے — کچھ شکرِ احسانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

میں ہوں اور احسانِ محمد لطفِ بے پایانِ محمد — دست من و دامانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

شورِ صلِّ علیٰ ہر سو ہے کیوں نہ اے مختار کہ تو ہے — زمزمہ خوانِ شانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

شیخ روشن دین تنویر

چل تو پڑا ہے قافلہ

چل تو پڑا ہے قافلہ پر ہے عجیب معاملہ
چلتے ہیں جتنا تیز ہم بڑھتا ہے اور فاصلہ

بے دریغ گردنیں گرتی ہیں کٹ کے پے بہ پے
زندگی حسین ہے دورِ زمانہ کربلا

رات ابھی ہے درمیاں کس کو خبر ہے ہمسفر ہو!
جاتے ہیں ہم کدھر۔ کدھر جاتا ہے میرِ قافلہ

دیکھ چشمۂ بقا بیٹھا ہے پاؤں توڑ کر؟
ہم نے ترا بھی اے خضر ہے دیکھ لیا حوصلہ

سجدے کے واسطے اسے ہیں نے تو کچھ کہا نہ تھا
اب مَیں بناؤں کیوں ترا بگڑا ہُوا معاملہ

تُو نے تو ایک کُن کہا دونوں جہان بن گئے
دونوں جہان سے مجھے کرنا ہے اب مقابلہ

ارشد ترمذی

کیا عجب ہے مری طبیعت بھی　　زاہد و رندِ میگسار ہوں میں

ہے عقیدت بتوں سے بھی مجھ کو　　اللہ والوں کا رازدار ہوں میں

رُوئے زیبا کی اک جھلک کے لئے　　کتنا بیتاب و بے قرار ہوں میں

رت جگا کر رہے ہیں اہلِ خدا　　آج مسجد میں شب گذار ہوں میں

آج کیوں اپنے ہی گناہوں پہ　　آپ ہی آپ شرمسار ہوں میں

ان کے ستموں کی کچھ نہیں پرواہ　　ایک طالبِ وفا شعار ہوں میں

کتنا احساں ہے میرے مولا کا　　اپنے مقصد میں کامگار ہوں میں

محترم ہوں میں بزمِ رنداں میں　　کوئے جاناں میں خاکسار ہوں میں

جم سکے گی نہ آج محفلِ مے　　دوستو آج روزہ دار ہوں میں

سارے آلام بھول کر ارشدؔ
وقفِ غمہائے روزگار ہوں میں

ارشد ترمذی

ان کی محفل میں ہوا حشر بپا میرے بعد
جب کبھی واں پہ ہوا ذکر مرا میرے بعد

غیر کرتے تو مجھے رنج نہ ہوتا ہرگز
دوستوں ہی نے کیا میرا گلہ میرے بعد

ساقیا آج تو جی بھر کے پلا دے پی لے
یوں نہ چھائے گی کبھی کالی گھٹا میرے بعد

مطربِ شوخ نوا، میری غزل، رقصِ شرر
ہو گا سب کچھ ہی وہاں میرے سوا میرے بعد

زندگی اپنی تو بس یونہی گذر جائے گی
رنگ لائے گی مری آہِ رسا میرے بعد

ایک بھی اہلِ نظر ساری خدائی میں نہیں
"کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد"

محفلِ رنداں میں مقبول نہ ہو گی ارشد
اس بتِ شوخ کی کوئی بھی ادا میرے بعد

کریم قمر
ایف اے (سال دوم)

مجھ سی پائیں گے نہ جب خوئے وفا میرے بعد
خود بدل دیں گے وہ اندازِ جفا میرے بعد

تیرے کوچے سے اُٹھا آج جنازہ کس کا
کس کو بخشا یہ وفاؤں کا صلہ میرے بعد

کتنے دل ہیں کہ جو سینوں میں تڑپ اٹھتے ہیں
اہلِ دل لیتے ہیں جب نام مرا میرے بعد

لاسکی ان کو نہ جو میری فغانِ دلدوز
کون لائے گا یہاں ان کو بھلا میرے بعد

جادۂ عشق پہ جب چلنا ہو اے دل والو!
یاد رکھنا میرا پیغامِ وفا میرے بعد

ہم ترستے ہی رہے ان کے تلطّف کو قمرؔ
اہلِ دنیا پہ کرم اُن کا ہُوا میرے بعد

سالِ نو

عابد ربّانی
(سال اول، آرٹس)

حیاتِ انسانی کا بحرِ بیکراں
موجزن ہے۔
ایک پُرجوش موج
مسکراتی ہوئی اک قدم آگے بڑھی
ساحل سے ٹکرائی
ناگہاں!!!
شور بپا ہوا
"پیش قدمی مبارک"
اس موج کی پیشانی پہ
حسرتوں کے گھونگھے
ناکام تمناؤں کے صدف
خاموش چیتے کی طرح
ساحل کو گھور رہے تھے
یکایک موج نے
پیشانی کو جنبش دی
دوسرے لمحے
موج کی آغوش میں
امیدوں کے گوہر
جگمگا رہے تھے ——
موج نئے ولولے
نئے عزم سے بپھری —— ٹکرائی
ساحلِ آلام کی مٹی
موج کے سامنے
سرنگوں ہو کر
سمندر کی تہِ عمیق میں جا رہی ہے ٭

غزل

پروفیسر چوہدری محمد شریف خالد

مری زندگی جاودانی نہیں ہے
جوانی میں بھی شادمانی نہیں ہے
عناصر کی ترتیب ہے زندگانی
یہ ترتیب بھی غیر فانی نہیں ہے
ہیں لبریز دُرِّ نم اگر میری آنکھیں
ہے خوں آرزو کا یہ پانی نہیں ہے
جوانی وہ کیا جو ہو ننگِ جوانی!
حقیقت ہے یہ بدگمانی نہیں ہے
ملامت ہے جب اس نصیحت میں پنہاں
ہے پردہ دری، رازدانی نہیں ہے
سنے گا اگر تو پریشان ہوگا
یہ رودادِ غم ہے کہانی نہیں ہے
اگرچہ ہوں خاموش و مجبور و بے بس
خموشی میری بے زبانی نہیں ہے

○

AL-MANAR

Jan. Feb. March

1963

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE,
RABWAH

بسم الله الرحمن الرحيم

الله نور السموات و الارض ، مثل نوره كمشكوة فيها مصباح ، المصباح
فى زجاجة ، الزجاجة كانها كوكب درى يوقد من شجرة مبركة زيتونة
لا شرقية ولا غربية يكاد زيتها يضى ولو لم تمسسه نار، نور على نور ، يهدى
الله لنوره من يشاء .

All is the Light of the heavens and the earth. The similitude of His Light is as a *lustrous* niche, wherein is a lamp. The lamp is in a glass. The glass is as it were a glittering star. It is lit from a blessed tree—an olive—neither of the east nor of the west, whose oil would well-nigh glow forth even though fire touched it not. Light upon light ! Allah guides to His Light whomsoever He will.

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College
Rabwah

★

Jan., Feb., March
1963

Chief Editor
IJAZUL HAQ QURESHI
Editor
HASSAN MUSTUN

Contents

		Pages
1.	Editorial ...	1
2.	Strikes *Prof. Habibullah Khan* ...	3
3.	The Badshahi Mosque *Ijaz-ul-Haq Qureshi* ...	9
4.	Under the Cedar Tree *Muhammad Azeem Khan* ...	12
5.	Will Power *Parwiz Kassim Hossen* ...	13
6.	Bed *Abdul Ghafoor Ihsan* ...	15
7.	Aspects of English University Life *Michael Williams* ...	17
8.	Be a Back Garden Explorer *A Rafey Jafrey* ...	18
9.	X-Rays *Munir Ahmad* ...	21
10.	Islam on World Peace *Rashid Ahmad Javed* ...	23
11.	What is death *Muhammad Ashraf Choudhry* ...	28
12.	Education Development in Kashmir under Muslim Rule *Naseer Mahmood Kashmiri* ...	30
13.	Way to Success *Abdul Subhan Adil* ...	32
14.	The Voice of Wisdom *Abdul Manan Bhatti* ...	32
15.	Man's best friend *S. Naeem Haider* ...	33

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah, and
Published by A. R. Junaid for T. I. College, Rabwah.

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College, Magazine.

Vol. XII	Jan. Feb. March, 1963	No. 2

Editorial

The days have rolled into months and months into a year and we have stepped into the new year. Among the students some are on the top rung of the ladder of education, some in the middle while still others at the foot. How many of them will climb it successfully, only God knows. There is no doubt that our aims are realised by God, but 'God helps those who help themselves', goes the saying. Therefore it is our earnest duty to strive hard to achieve our aim.

The results of the December test have been declared ; very few have come out with flying colours. The first thought of the plucked students may be that they are of a low intelligence. They take themselves to be lacking in high calibre which they cannot achieve. But is it right ? How many of them have sincerely asked themselves the cause of their failure. If they had taken the pain to answer it, they would have come to know that the defect lies in being irregular in studies.

By being irregular in your studies, you are fashioning your character in the wrong way. You sow an act and you reap a habit ; you sow a habit and you reap a character ; you sow a character and you reap a destiny. Obviously the formation of habits is very important.

No doubt students find many excuses for not being regular in their studies and at first it may be extremely irksome, but as practice

makes perfect in all things so it is with practice that they can learn to be regular. Intellect is not born, it is developed and it is up to you to develop it. Men have, within them, sleeping faculties which if developed, can enable them to cross the threshold in full consciousness. This may take some time but you must persevere for it is vitally important.

Perfection in this world can only be achieved by possessing a good sense of regularity and a strong will power. Take care to launch your self with as strong an initiative as possible.

Nothing has vexed the human-beings more than contriving ways and means for succeeding in the struggle fot existence. For the acquisition of this very object, one does not demur even to enter a perilous avenue at the end of which lies one's resplendent future. Needless to cite examples, it is an established fact that success is hard to achieve; drudgery is the grey angel of success. It needs ample courage and determination to set one's heart on constructive side But to crown all, the realization of one's duties is a dominating factor in human destiny. The mere realization of heavy responsibilities lying on one's shoulders is sufficient incentive to actuate one for toil and moil.

So for as the student-life is concerned, it is of utmost importance to inculcate the spirit of realizing one's responsibilities, for it is this spirit which can goad a student on to hard work, and shun playing fast and loose in his studies. To succeed in academic career, it is of paramount significance to understand the value of one's time and concentrate all of one's efforts to achieve the cherished goal—crowing success at the year's end.

The habit of realizing one's duties and the resolve to perform them to one's full capacities is bound to leave lasting effects on one's practical life later on. Cradled in this habit, one will prove to be a benefitting personality for one's country as well by rendering meritorious services to its cause.

To sum up, we should realize the manifold responsibilities resting on us and relinquish lethargy in order to make the mark of ours and our nation at large.

Prof. Habibullah Khan,

STRIKES

At the dawn of every new year people usually look back at the year that has ended and draw useful conclusions from the past. From the educational point of view the year 1962 is unique in the history of our country. It can rightly be called the year of strikes. There have been strikes in all types of educational institutions both in the Eastern and the Western zone. In their frequency and magnitude they have no parallel.

We have heard of strikes and lock-outs in the labour class and among people working in different trades. They were regarded exclusively as a labour problem. So much so that a strike was generally defined as a stoppage of work by common agreement on the part of a body of working people for the purpose of obtaining or resisting a change in the conditions of employment. But uptil now we had never heard of a strike in the student community. Now things have suddenly changed. Not only the students but teachers and lecturers in colleges are frequently threatening with strikes. Such student strikes have taken place not only in Pakistan but also in India, Iran, Turkey and in many Western countries. They are becoming more of a fashion these days and are spreading in society like an epidemic. This calls for a serious study of the whole matter. Every well-wisher of the country should stop a while and ponder over this problem in a cool, unbiased manner. The students in particular should concentrate their attention on this issue and carefully go into the pros and cons of the matter. The gravity and seriousness of this problem cannot be denied. These few lines are being written with a view to enable the students to realize the utility or otherwise of this step.

So far as this sub-continent is concerned the method of strikes as a means of getting national grievances redressed and of obtaining political objections was introduced here by Mr. Gandhi. There is nothing novel in this method. It was copied from the West. Strikes were very common in European countries especially to-

wards the close of the 19th century. But for people in India they were something new. They gave a stick into the hands of the common man with which he could beat the foreign ruler. Here they served two purposes. In the first place they destroyed the prestige of the British rule and created a political awakening among the masses in the shortest possible time. In the second, they raised the status of Mr. Gandhi and he was acclaimed as a national hero. When he introduced this technique in this country he was fully aware of these consequences.

Here we need not go into the reasons for which the non-cooperation and the civil disobedience movements were started. Nor is there any need for us to evaluate the utility of this step. What is pertinent to the subject in hand is that the success of this method has left this impression upon our political workers and would-be-leaders that the quickest way of achieving objectives and of attaining popularity among masses is to organise and stage strikes. The pity is that the political wizards have selected the students community for their nefarious designs.

The effectiveness of strikes as a political weapon is not the issue at hand. However, let us suppose for a minute that they are effective. Even then there is no justification for their use at the present time. The rulers, whoever they may be, and the ruled, both belong to the same nation and the same country. There may be some justification in the application of strikes against foreigners but there cannot be any when we have attained freedom. If recource to strikes and lawlessness is justified against one party or against one group of people it would equally be justified against another and would ultimately lead to anarchy and complete chaos Once the sanctity of law is broken and people are encouraged to go their way, there would be no end to the trouble. Once the people are excited to the point of disobedience, they become reckless and get out of control. For the time-being they do not think of the consequence and take pleasure in disruption—even in burning and loot. Strikes frequently take such a turn. It is a folly to think that strikes can also be peaceful. Who can give the guarantee that the so called peaceful strike will remain peaceful upto the end and a well organised march past on the road will not degenerate into an unruly mob. Usually on all such occasions the roudy element acquires the control and leads the strikers

Removal of an Ambiguity.

Before I proceed to explain the importance of this verse regarding the constitution of the "Islamic League of Nations" I deem it necessary to remove an ambiguity which may arise in the mind of the reader. This ambiguity lies in the word مومنين (momeneen) of the verse. The objection is sometimes raised that as only the faithfuls or believers have been addressed in the verse, therefore it is unjust to infer from it the idea of the League of Nations. The answer to this objection is : Aren't the faithfuls human beings? Surely, they are! So when a faithful and a common man are both related to blood and flesh, it matters little whether the first address is to believers or otherwise. In the present context it is the principle which matters and not those upon whom it had been applied. The reader should not, therefore, be led astray by this confusion.

Let's now prepare the constitution of the Islamic league of Nations, in the light of the above verse.

Constitution of the Organisation :

The organisation, under its Islamic concept will function as follows :

(a) When some wrangling seeks way between any two nations, all other nations should remain completely neutral as far as the disputing nations are concerned. They should immediately and unitedly force both of the related nations to bring forth their dispute to the league.

This should be the first step by all the non-aligned nations. If the two disputing parties give in to the will of non-aligned world, the issue will automatically be solved through negotiations and other peaceful means. The evil will be nipped in the bud.

Refer please to this part of the verse :

وان طائفتن من المومنين اقتلوا فاصلحوا بينهما ،

(b) If one of the parties refuses to admit the authority of the League of Nations and continues its agression, all other nations should fight against the the party that transgresses.

Reference to this part of the verse :

فان بغت احديهما على الاخرى فقاتلوا التى تبغى،

(c) As one nations cannot face all other nations of

the world, it will finally come to cessation. When this happens, war should be held up everywhere. The transgressor will be fought until it returns to the command of Almighty. Complete destruction of the offender is not allowed.

See this part of the verse :

فقاتلوا التی تبغی حتی تفیٔ الی امر الله .

(d) When the offender returns to the command of Allah i.e. towards settling the issue through peaceful means, the actual issue be decided upon under the auspices of the League. The decision will be imposed upon the first belligrant nations, all the rest will act as judges.

Reference to the part :

فان فاءت فاصلحوا بینهما بالعدل .

(e) Whatever solution of dispute is arrived at, that be carried out justly and fairly. No unjust imposition be obtruded upon the *offender* party. A nation should not be impeached unjustly merely on the score that it did not obey the orders of the League in the first instance.

Refer please to this part of the verse :

فاصلحوا بینهما بالعدل و اقسطوا .

It is obvious from the preceding discussion that Islamic League of Nations is very sensitive regarding peace affairs. Any organisation aiming at world peace can succeed only in the case that it adopts the charter of the Islamic League of Nations.

For better understanding of this charter let us study some of the depraving consequences of the digression from it.

(i) The first unfortunate consequence of the disgression from it is that when some hostility gets created between two nations, others try to exploit the situation. But it is not a 'cricket-match' which should be enjoyed by outsiders. It is a matter of world peace. The destruction of one or two nations cannot bring prosperity to the world. As a whole the world would look more poor and deserted than before. According to the Islamic concept, other nations should make peace between the two hostile nations.

(ii) The second evil lies in the fact that if they enter the game at all, they make the situation wrose than before. Some nations join the 'A' block and some the 'B'. This folly has resulted in two great

world wars. Islamic concept does not favour making of the blocks. This merely aggravates the situation.

(iii) When blood-shed has fulfilled its task, 'Peace Conferences' are held and treaties arrived at But the services that they render are, that instead of decreasing world tension they increase it. Defeated party is dragged very mercilessly. The burden of reparations is usually more than the defeated party can afford. Jealousy and sense of vengeance continues to grow with more intensity than previously. This jealousy is between the conquered and the allied conquerors. Another bad consequence arises among the allies themselves. How the conquered places be distributed among them? Every one gives more importance only to his owuself. Serious conflits arise thereupon. This again increases the world tension. 'Berlin Issue' is the best example explaining this state of affairs. According to Islamic concept, only the actual and original issue be solved. Other nations should not act as a party in war but as judges between the original belligrant nations.

(iv) Some body may raise the question of 'war-costs' for the justification of reparations. But this justification becomes futile, looked upon from Islamic point of view. First, because it gives birth to increasing sense of enmity and hostility. Secondly, because if other nations act according to the constitution of Islamic League of Nations, it is just possible that the potential war-fear no longer remains there. One nation won't dare facing whole the world. Hence no question of 'war costs' will arise. Thirdly, because if war looked indispensable, the costs of war would get distributed among so many nations of the world equally. It would come to a very meagre amount as far as each nation is concerned. Under these conditions each nation can easily afford these expenses. Moreover, taken from ethical point of view, demand for reparations does not look nice on the score that world peace is equally beneficial to all nations.

(v) The fifth and final depressing effect of the digression from Islamic Concept is that nations make individual treaties. This decreases the respect and importance of an organisation like U.N.O. It is very difficult, under such conditions, to take a joint venture against the nation which is disturbing the peace of whole world. Blocks will again appear.

In fact there should be 'an all-nations' treaty'. No single nation

will dare violating the charter because, according to the treaty terms, she knows that the violation on her part will result in a joint venture against her.

If these evils are removed and the charter of the Islamic League of Nations adopted, I'm sure any U.N.O. can succeed in maintaining peace and order in the world. The reason behind the conviction is that such an organisation will be hundred percent, full of life and affective to the utmost.

(Continued from page 17)
whose knowledge he hopes to rival and whose judgement he often questions. He is full of his own importance and secretely believes that the country would be better off if it was run by students. In this and in many ways I think he is not so very different from students in Pakistan. And that is perhaps the right note upon which to end.

(Continued from page 22)
using X-radiation provides a way of producing a large number of mutations in a short time, instead of waiting for occasional spontaneous mutations to occur, perhaps as a result of cosmic radiations. This method has been widely used in experimental agriculture and horticulture. However, the majority of such mutations is undesirable; that is, the mutations may be crippling, or the organisms or its descendants may not survive. By selecting the occasional favourable mutations, plants with new and desirable characteristics may be produced.

Moreover X-rays help the jewellers to distinguish true gems from false gems. Custom Officers use them for detecting hidden materials. While X-rays can an immensely powerful tool in m fields of research, injury and e death can result from their carele use.

Mohammad Ashraf Choudhary

What is Death?

Our ancestors identified life with breathing. '*Spirit*' is only a latin word for breath. We are now apt to identify it with the heartbeat, and every time a man or woman, whose heart has stopped for a few minutes, recovers, people think that the dead has been restored to life, but this is not the case. The heart is only a pump for blood and the lungs a means of exposing it to air. We can already keep the rest of an animal alive for some hours with an artificial heart and lungs, and it is only a question of time before this is done with a man. One of the main difficulties is to prevent the blood from clotting in the artificial heart.

The facts about life are much more complicated. We can do a certain amount of replacement with spare parts, as we transfer quart of one man's blood into other. But a man is only to some ent a machine. So we cannot very much replacement of this And when we say that a is dead, we mean that his luality has ceased rather than his machinery has stopped working, even though the two events generally go together.

When one is dead I can take some of the white blood corpusles and grow them in a suitable flask, certainly for weeks, perhaps for years If I knew enough I could do the same with many of other tissues. This is already possible with the cells of embryo chick or rats. A dead man has got life., but not of his own, its cell..

One can kill a rabbit by a blow on the neck and take out its heart. If the heart is kept warm and supplied with right solution and plenty of Oxygen it will go on beating for hours. The heart is alive though the rabbit is dead. The same is true of human hearts, which have occasionally been taken out and kept alive for some time after their owner's death.

What is this individuality which comes to an end at death? Is it something outside the lives of parts, and added to them, or is it just

the unity by co-operation of these sub-lives. There is a good reason to adopt the second view. A tune does not consist of notes and melodies. If the notes are played in proper order the melody is there. One cannot reason so directly about a man, because a man consists of a very large number of cells, about ten thousand million millions ; and no one of them is as essential to the life of the whole man as the bowler to the cricket match.

Against the theory that an individual's soul leaves the body at the moment of death, is the experience of brain surgery. As the brain is destroyed the personality gradually fades out, until a body born with no upper parts to its brain shows less signs of consciousness than a fish even though it may live for a year. If there is a detachable soul it can certainly be detached bit by bit, and all that is specifically human in it may be lost long before death. To many it seems more reasonable to regard the soul as a function of co-operative brain-cells.

There are may ways of dying. Usually some organ plays its part so badly that the others are one by one put out of action. In pneumonia the inflamed lungs let through so little Oxygen that the rest of the body is suffocated. In heart disease the heart may stop suddenly, or pump so inefficiently as to suffocate the other organs. In many diseases the part of brain which sends down nervous impulses to the breathing muscles is poisoned, and breathing ceases.

But science knows nothing of a definite moment of death in most cases. After the last breath a few more minutes of life could generally be vouchsafed by artificial respiration.

After the last heart-beat a surgeon can open the abdominal wall and, by putting his hand up into the chest, and rhythmically squeezing the heart, keep the blood circulating for a short time. Death is usually a gradual process, well described by the word Dissolution. After death of the body as a whole, many individual cells live on for hours and days, till they too die. Death is the end of a particular pattern of material and mental happenings which are bound with one another.

Naseer Mahmood Kashmiri

Educational Development in Kashmir under Muslim Rule

The lovely land of Kashmir which is famous for its beauty, high mountains, picturesque lakes and archaeological wonders is also proud of its educational greatness. A study of the history of Kashmir shows that it never lagged behind other countries of the world in the field of education. Under Muslim rule when the Kashmiris conquered many large countries of Asia it was a great independent Islamic kingdom. It was a great seat of learning and education. Some of the finest institutions for higher learning were established here which attracted great scholars of the age from abroad. It was due to these institutions that Kashmir produced scholars of international reputation.

Institutions: Sultan Shahab-ud-Din who ruled Kashmir from 1354 to 1373 A.D. established a college for teaching the Holy Quran. Abul-Mashaikh Sheikh Suleman received education at this very college. He eived the title of Im m-ul-Qura, the er of Qaris. Many other colleges schools were also established mportant towns and villages g his period.

Another college was built by Sultan Qutab-ud-Din in 1373 in Sirinagar. It was headed by Pir Haji Mohammad Qari. It flourished till 1810 A.D. Some of the famous scholars of Islamic world such as Mullah Mohsin Fani, Abdus-Sattar Mufti, Sheikh Rehmat Ullah Tarabali, Tahiri Gani Ashai, M.Zaman Nafi Ashia, Khawaja Qasim Tirmzi and Mullah M. Kaus received their education at this college. A free hostel was attached to it.

Sultan Sikandar who ruled Kashmir from 1389 to 1413 A.D. was a great patron of Art and Literature. He attracted great scholars from Iraq, Khurasan and Samarkand. He also founded a college alongwith hostel and the income of several villages was especially set apart for its expenses. Qazi Mir Mohammad Ali Bokhari was the Principal of this college and other lecturers like Mullah M. Yousuf, Mullah Sadar-ud-Din Kashi, Mullah M. Afzal Bokhari and Hussain Mantaqi, were appointed for the teaching of Philosophy, Mathematics Hadith and Metaphysics respectively.

King Zain-ul Abideen commonly

known as *"Bud Shah* the Great" who ruled over Kashmir from 1420 to 1470 A.D. was a great lover of education, literature and Arts. His period was the golden period in the History of Kashmir. He set up a magnificient university at Srinagar, which has lasted till now. Mullah Kabir Nahvi was appointed the first Chancellor of this famous university. He was the author of a commentary on 'Sharah Mullah' and was Sheikh-ul-Islam. He was famous for his learning and piety. This university attracted notable scholars from abroad who acted as its teaching staff. Mullah Ahmad Kashmiri, Mullah Hafiz Baghdadi, Parsa Bokhari, Jamal-ud-Din Khawaragmi, Mir Ali Bokhari and Yousaf Rashid were some of them.

The revenue of several villages was reserved for the expenses of the university. A translation-bureau was also established here Many books of Arabic and Sanskrit were translated into Kashmiri and Persian. The old religious and historical books like Mahabharat and Rajtarangni were also translated.

A huge library was attached to it. The Sultan sent his agents abroad to collect books and manuscripts for the library. It was through his efforts that it became leading library of the world. He established paper mills for spread of education. He also established many technical colleges for giving the training of Kashmiri industries, like Kashmiri Shawls, Kashmiri carpets, wood carving and silk industries etc. He himself went to Samarkand and Bokhara for acquiring higher education. When he came back he established schools and colleges in every town and village of his empire.

Hindu scholars also enjoyed a great respect. A Hindu pundit Seb Butt was his minister for external affairs Pandit Oota Som was the Director of Education Department.

Pandit Her-Gopal Khasta says admiring the Sultan that he was not only Bud-Shah (great king) but he was called Butt Shah, Butt means in Kashmiri Hindu, for his friendship with Hindus of the country.

Sultan Hussain Shah was also a great patron of learning and Art. A residential school and some other institutions were established by him.

Sultan Hussain Chak founded a great college. A library and a hostel were attached to it. A 'jagir' was alloted to the college to meet its expenses. Sheikh Fateh Allah Huqqani was its Principal.

(Continued on page 34)

Abdul Subhan Adil

Way to Success

- Confidence in yourself is the first step on the road to success.
- The best way to succeed in life is to act on the advice you give to others.
- By reading we enrich the mind ; by conversation we polish it.
- Conference is very useful but don't spend all your time in talking.
- The best worker is mostly cheerful when he is working hardest.
- Prescription for successful life: Acquire honesty ; seek humility ; practise economy ; love fidelity.
- Complain not of the shortness of life, strive rather to employ the time carefully.
- Don't judge results by the time taken over the job.
- Keep aloof from quarrels, be neither a witness nor a party.

Abdul Manan Bhatti

The Voice of Wisdom

- Playing fast and loose is to fritter away one's energies.
- Silence is the best cure for anger.
- No virtue is greater than doing justice.
- He who brags, in fact, descredit himself.
- Contentment is an ever-lasting wealth.

S. Naeem Haider

MAN'S BEST FRIEND

Wherever there are dogs, there are dog stories—touching, amusing and sometimes astonishing. Here are some true tales that I have collected from dog-lovers.

A Real Pal :

One day, as I went into the butcher's shop, a big Irish setter slipped in with me. "Hello, Rusty" the butcher said, smiling. "Catch!" Rusty caught a large bone, wagged his tail in thanks and ran out. A few minutes later he was back. The butcher threw him another bone and Rusty was off again. The butcher, grinning broadly, told me about him.

Rusty lives in a barn with an old setter-pal called Red. They used to come in here for bones. Last year Red was hit by a car, and now he is half blind and very lame. So Rusty comes in every morning, gets a bone for Red, and then comes back for another for himself. We always manage to have two big bones ready for him.

Bone Trouble :

Our Alsatian, named Jackie, had trouble with a dog from down the road. Every time Jackie buried a bone, the watchful little dog would dig it up five minutes later. Then one day I saw Jackie carry two bones to a spot on the lawn. First she dug an enormous hole and put her big bone in, burying it carefully. Then she laid the small bone on top and covered it lightly with earth. It was only a few minutes before the small dog, as usual, dashed to the freshly dug spot. Scrabbling furiously, he presently trotted off in triumph with the little bone. Jackie never moved a muscle. She just sat and watched. Her clever trick had worked beautifully.

Saved from Danger :

One night we heard Jackie give her deep-voiced "warning" bark from outside the house. I went to investigate, but as I opened the back door Jackie dashed up and pushed me back against it. Then she ran towards our barn. Something serious had happened. I started after her, but again Jackie ran back to me. This time she forced me backwards with her huge

front paws on my chest. Then I heard the rattle of a chain and bellow of rage. Our great black bull, which weighs a ton, had broken lose. It took four dangerous hours to get the beast back in his stall If it had not been for Jackie I dread to think what would have happened to me.

Jackie as a News-Dog :

Jackie knew my newspaper delivery route as well as I did. If I started to pass a customer's house, she'd bark to remind me. But if the customer had moved, I simply said, "Not any more, Jackie," and next day she'd pass that house without a glance. One morning, near the end of the long route, I cried in dismay, "Jackie, we have missed one, and I don't know which" Jackie whimpered a moment, then pricked her ears, barked, and began running back and forth as if to say, "Follow me !" I followed her. Back near the beginning of my route, Jackie made a dash for a porch. It was the home of a new customer — and the one I'd missed.

Motto for a Dog Kennel :

I love this little house because :
It offers, after dark,
A pause for rest, a rest for paws,
A place to moor my "bark".

(Continued from page 34)

Sultan Hussain also collected many thousand books for the old and famous library of Budd-Shah the great. For this educational development, besides the other titles of "Switzerland of Asia", "Venus of Asia" "Paradise of Earth" the people of the world gave Kashmir the title of "Iran-e-Saghir".